ATIF HUSSAIN
A Critical Review of
Motivational Speaking & Success Literature
کامیابی کا مغالطہ
مبالغے اور دھوکے کی داستان

A CRITICAL REVIEW OF

MOTIVATIONAL SPEAKING & SUCCESS LITERATURE

سیلف ہیلپ اور موٹیویشنل اسپیکرز کی حقیقت

عاطف حسین
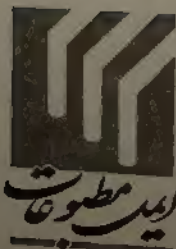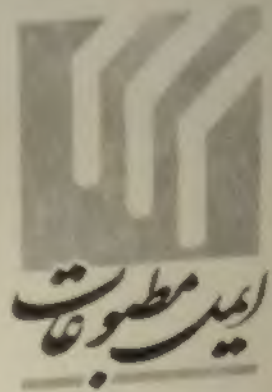
Kamyabi Ka Mughalta
Author: Atif Hussain
Emel Publications, Islamabad

نام کتاب : کامیابی کا مغالطہ

مصنف : عاطف حسین

ایڈیشن : اوّل 2016

ناشر : ایمل پبلیکیشنز۔ اسلام آباد www.emel.com.pk

مطبوعہ : انڈسٹری پرائیویٹ لمیٹڈ، اسلام آباد industree.com.pk

السٹریشنز/ خاکے : شکیل اعوان

ISBN : 978-969-9556-26-5

تقسیم کنندہ : ۱۲، سیکنڈ فلور، مجاہد پلازہ، بلیو ایریا، اسلام آباد۔
فون: 92-51-2803096, 0342-5548690

لاہور : اردو بازار، فون: 0323-4839655

قیمت : 400/= روپے

پاکستان بھر سے براہ راست منگوانے کے لیے 0342-5548690 پر کال یا SMS کریں۔

انتساب

مہربان استاد

پروفیسر شیخ محمد رفیق کے نام

جن کے میری ذات پر بے شمار احسانات میں سب سے عظیم

میری آزادانہ سوچنے کی صلاحیت کی حوصلہ افزائی اور پرورش ہے۔

فہرست

خیالات کی طاقت 63

کج فکری کی غذا

Junk Food for Though

کنفیوشس نے کہا تھا "میں سب سے زیادہ نفرت ان چیزوں سے کرتا ہوں جو غیر حقیقی ہیں مگر حقیقی ہونے کا دھوکا دیتی ہیں"۔

زندگی کا سفر، اسکے مطالبات، زمانہ اور زمانہ سازی جتنے اہم موضوعات ہیں اتنے ہی مشکل اور پیچیدہ بھی۔ کامیابی کی تعریف اور اس کے حصول کی کوشش بھی کچھ ایسا ہی موضوع ہے۔

اِدھر کچھ سالوں سے پاکستانی عوام -حسب عادت- بھیڑ چال کا شکار بنتے ہوئے، سرما کی بارش میں کھمبیوں کی طرح اگ آنے والے موٹیویشنل اسپیکرز سے کامیابی کے گر سیکھنے کے درپے ہو چلے ہیں کہ ہر آنے والے اسپیکر کے حصے کے بے وقوفوں میں اضافہ ہی دیکھنے کو مل رہا ہے۔

کامیابی کی تحریک Motivation فروخت کرنے والے ان خود ساختہ اسپیکرز نے جس طرح طلبہ، نو واردان ملازمت، حتیٰ کہ جہاں دیدہ اور تجربہ کار پیشہ ور افراد کو اپنے چنگل میں جکڑ کے خود کو ناگزیر ثابت کر رکھا ہے وہ قابل رحم تو ہے، تشویشناک بھی ہے۔ اپنی آنکھوں میں کامیابی کا خواب سجائے یہ افراد جب ان اسپیکرز کی لچھے دار گفتگو کے زیر اثر خود کو چشم تصور سے خیالی دنیا میں راج کرتا دیکھنے لگتے ہیں تو یہ نشہ کسی بھی نشہ سے زیادہ کیف آگیں معلوم ہوتا ہے۔ مگر آنے والے وقت میں جب یہ نشہ ٹوٹتا ہے اور زمینی حقائق سے آنکھیں چار ہوتی ہیں تو انکی حالت بھی اس انسان کی سی ہوتی ہے جو نشہ نہ ملنے پہ خود کو نوچ رہا ہوتا ہے۔

اس صورتحال سے ہماری قوم کی مرعوبیت اور فکری افلاس کا اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیمی اداروں نے جسے ختم کرنے

کے بجائے بڑھاوا دیا ہے۔قوم اس سطحیت کا شکار ہو کر اس مغربی "جنک فوڈ فار تھاٹ" سے اپنی بھوک مٹانے کے درپے ہے۔

اپنی اس تشویش کا ذکر گاہے دانشور احباب سے کرتا تو انکا تاثراتی ردعمل کچھ ایسا ہوتا کہ خود ہی خفت محسوس کرتے ہوئے ہنس کے جھینپ مٹانے لگتا۔آخر کو زمانے کے غالب چلن کے خلاف بات کرنے کی اتنی قیمت تو ادا کرنی پڑتی ہے۔اس دوران ایک دوراندیش دوست نے بین الاقوامی ریسرچ آرگنائزیشن سے مستعفی ہو کر "کامیابی کا کاروبار" شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ کوئی اور کاروبار کامیاب ہو یا نہ ہو کامیابی کا کاروبار خوب جاری ہے۔شاید انکے نزدیک سیلف ہیلپ سے مراد اپنی ہی مدد ہوتی ہے۔

کامیابی، مثبت سوچ، اپنی قسمت خود بنایئے--واہ کیا شاندار الفاظ ہیں۔مگر کیا یہ موٹیویشنل اسپیکرز ان الفاظ کو اپنے معاوضہ یا مالی فائدہ کی بنیاد کے علاوہ بھی کسی طور دیکھتے ہیں؟ کیا ہماری زندگی کے ہر جذبہ اور ہر انسانی آدرش کو مخاطب کرنے کے لئے بہروپئے اور شعبدہ باز ہی رہ گئے ہیں؟

کب تک ہماری زندگیاں سرابوں کا تعاقب کرتے گزریں گی اور ہم جدید مغربی فکر کی تلچھٹ کو امرت دھارا سمجھ کر پیتے رہیں گے؟ مانا کہ فنکار اور تفریح کا بھی زندگی میں مقام ہوتا ہے مگر کیا ہم انہیں اپنی نسلوں اور مستقبل کے ساتھ یوں کھلواڑ کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟

مصنوعی مسکراہٹ چہرے پہ ٹکائے، کاروباری اخلاقیات کے بھرپور مظاہرے کے ساتھ جب یہ "بول کار" اپنے سامعین کے سامنے رستم کی طرح دھم سے کود کر آتے ہیں اور باتوں کے طوطا مینا اڑانے لگتے ہیں تو دل کسی موسیٰ کی طلب کرتا ہے جو آ کر اپنا عصا ڈالے اور یہ تماشا ختم کر دے۔جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے والوں کو جھنجھوڑ کر اٹھائے اور زندگی کی جنگ لڑنے کو حقیقی ہتھیار دے کر میدان میں اتار دے۔

بدقسمتی سے ان میں سے کچھ حضرات نے اپنے کاروبار کے لئے مذہب کو آلہ کار بناتے ہوئے ہدایت ربانی کے الفاظ و آثار کو بھی اشتہاری جملوں کے طور پر استعمال شروع کر دیا۔مذہب وہ مظلوم جنس ہے کہ استحصال کی ہر

صورت کو جواز بخشنے کے لئے ظالم انسان کے ہاتھوں استعمال ہو جاتا ہے۔ یہ جس کی فلاح کے لئے آیا تھا اس نے خود اسے ہی فروخت کرنا شروع کر دیا۔

ظالمو! خدا کی قسم تم ہم سے دگنا معاوضہ لے لو مگر انسانی ذہن کی برتر صلاحیتوں اور ولولوں کو کذب و دروغ کا موضوع نہ بناو، ہماری نسلوں کے مستقبل کو اپنی چرب زبانی کی بھینٹ نہ چڑھاؤ۔

اس موضوع عزیزم عاطف حسین کی کچھ قلم برداشتہ تحریریں پہ فیس بک پہ دیکھنے کو ملیں تو لگا کہ دانش صرف دانشوروں تک ہی محدود نہیں، سو موصوف کو مسلسل تحریک دیتا رہا۔ اس امکان کی کلی، پھول کی صورت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

میں ممنون ہوں قبلہ گاہی احمد جاوید صاحب کا کہ انہوں نے وقت نکالا اور اپنے خیالات کو تحریر کی صورت دی۔ محترم عاصم اللہ بخش اور حسنین جمال نے بھی میری خواہش پہ کتاب میں شمولیت کے لئے اپنے شذرات فراہم کرتے ہوئے ہمارے موقف پہ صاد کیا۔

شاہد اعوان

0321-5168572

info@emel.com.pk

پیش لفظ

اپنی افتادِ طبع، تعلیم اور حالات کے باعث میں ایک عرصے سے مروجہ Success Literature کے متعلق مشکوک چلا آرہا ہوں اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی افادیت کے متعلق میرے شکوک اور الجھنوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ انہی شکوک کے باعث میں نے پہلے پہل اس لٹریچر کے بارے میں نجی گفتگو میں غیر سنجیدہ انداز میں استہزائیہ تبصرے کرنا شروع کیے، جن سے عموماً لوگ چڑ جاتے تھے۔ بعد کو میں نے سوشل میڈیا پر بھی ایسے ہی تبصرے شروع کر دیے۔ تاہم ان تبصروں پر ہونے والے اعتراضات کے جواب میں جب مجھے کچھ نسبتاً سنجیدہ تبصرے بھی کرنے پڑے تو احساس ہوا کہ اس لٹریچر کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ اور مربوط تنقید بھی کی جا سکتی ہے۔ لہذا میں نے Facebook پر ایک پیج بنا کر اکا دکا تحریریں پوسٹ کرنی شروع کر دیں جو اتفاق سے بعض سنجیدہ احباب مثلاً شاہد اعوان صاحب اور عامر ہاشم خاکوانی صاحب کی نظر میں آئیں تو انہوں نے انہیں پسند کرتے ہوئے شیئر بھی کیا۔ شاہد صاحب نے جلد ہی ناشرانہ نظر سے ان تحریروں کو دیکھتے ہوئے ان میں ایک کتاب کا امکان دریافت کر لیا اور حکم صادر کیا کہ میں اپنے خیالات کو ایک کتاب کی شکل دوں۔ ان کا یہ حکم میرے خیال میں میری مصروفیت، سستی اور المناک حد تک محدود علمی اور تحریری استعداد کے باعث قابلِ تعمیل نہ تھا لیکن کچھ لیت و لعل کے بعد مجھے ان کے تحکمانہ اصرار کے سامنے ہار ماننا پڑی اور یوں یہ کتاب وجود میں آئی۔

یہ کاوش کتنی وقیع ہے اسکا فیصلہ تو قارئین اور اہل علم کریں گے لیکن میرے علم کی حد تک یہ اردو زبان میں مروجہ Success Literature پر مربوط اور باقاعدہ تنقید کی پہلی کوشش ہے جو بہت سے اصحاب کیلئے

باعثِ دلچسپی ہوگی اور جن کی آراء اور تبصروں کا انتظار رہے گا۔

جن اہلِ علم نے میرے خیالات کی تائید فرما کر مجھے عزت بخشی ہے میں تہہ دل سے انکا ممنون ہوں۔انکی تحریریں کتاب میں شامل ہیں۔

عاطف حسین

پس منظر

سیلف ہیلپ بطور ایک صنعت

گزشتہ دو عشروں کے دوران ہمارے ملک میں سیلف ہیلپ خصوصاً موٹیویشنل لٹریچر کو بہت عروج حاصل ہوا ہے۔ نہ صرف مغربی مصنفین کی کتابوں کے تراجم ہوئے بلکہ ہمارے اپنے ملک کے قلم کاروں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اب ایسے لوگوں کی ایک پوری کھیپ تیار ہو چکی ہے جو انفرادی طور پر یا باقاعدہ اداروں کے پلیٹ فارمز سے سپیکرز، ٹرینرز، اور اسی طرح کے دوسرے ناموں کے ساتھ اس لٹریچر کی اشاعت اور ترویج میں مصروف ہیں۔ کاروباری، فلاحی اور سرکاری ادارے کامیابی کے گر سیکھنے، استعدادِ کار میں اضافے اور ملازمین کو Motivate کرنے کیلئے ان لوگوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ تعلیمی ادارے بھی طالبِ علموں کو ترغیب دلانے کیلئے انہی سے رابطہ کرتے ہیں۔ ان کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں چھپتے ہیں اور ان کی تحریریں، اقوال اور لیکچرز انٹرنیٹ کے ذریعے بڑی تیزی سے شیئر ہو کر داد پاتے ہیں۔ کم ہی کوئی بک سٹور یا لائبریری ایسی ہو گی جس میں آپ کو ان موضوعات پر متعدد کتابیں نہ ملیں۔ اب یہ ایک باقاعدہ صنعت ہے۔

موٹیویشنل لٹریچر سے میرا تعارف

راقم الحروف کا واسطہ اس لٹریچر اور اس کے مبلغین سے سکول کے زمانے سے ہی پڑتا رہا ہے جب کامیابی کے گر سیکھ کر ''بڑا آدمی'' بننے کی امنگیں اکثر جوان سینوں کی طرح میرے دل میں بھی کروٹیں لے رہی

تھیں۔ کالج کے زمانے میں جوشِ رجائیت کچھ ماند پڑا تو اس لٹریچر کے متعلق کچھ الجھنیں پیدا ہونی شروع ہوگئیں جو ازاں بعد یونیورسٹی میں بزنس ایڈمنسٹریشن کی باقاعدہ تعلیم کے دوران موٹیویشنل لٹریچر سے بہت زیادہ تعرض کے نتیجے شدید تر ہوتی چلی گئیں۔

بزنس سکول، کارپوریٹ دنیا اور الجھنیں

بزنس سکول میں، خصوصاً ہیومن ریسورس مینجمنٹ کی اختصاصی تعلیم کے دوران اور عملی زندگی کے ابتدائی دنوں میں کامیابی کے متعلق جو کچھ میں پڑھ، سن اور دیکھ رہا تھا وہ دو لحاظ سے میرے لیے خاص طور پر الجھن کا باعث تھا۔ اول تو یہ کہ اس لٹریچر میں اس تصور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ انسان اپنی قسمت کا خود مالک ہے اور اسکی کامیابی یا ناکامی، خوشی یا پریشانی کی ذمہ داری کلیتاً اسی پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن میرے اردگرد کئی افراد اور خود میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اس دعوے کو جھٹلاتا ہوا محسوس ہوتا تھا (اس پر مفصل گفتگو آنے والے ابواب میں ہوگی) دوم یہ کہ کامیابی کے جو نسخے ہمیں سکھائے جا رہے تھے وہ ہر لحاظ سے میرے شخصی آدرشوں کے خلاف جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ہمارے بزنس سکول میں اس بات پر بہت زور ہوتا تھا کہ طلبہ کو "ایگزیکٹو" نظر آنا چاہیے جس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ گھس گھس کر شیو کی جائے، ٹائیاں پہنی جائیں اور انگریزی بولی جائے (ترجیحاً منہ بگاڑ کر)۔ سارا زور اسی طرح کے تصنع کے ذریعے ایک خاص طرح کا آدمی نظر آ کر کچھ Tricks & Tips کے ذریعے 'کامیاب' ہونے پہ ہوتا تھا نہ کہ کسی قسم کا سنجیدہ اور حقیقی عملی مزاج پیدا کرنے پر۔

عملی زندگی میں آنے کے بعد جب مختلف فورمز اور ٹریننگز میں شمولیت کا موقع ملا تو تصنع، مبالغے اور کھوکھلے پن کو اس سے بھی بدتر صورتوں میں دیکھا۔ اس طرح کے ایونٹس میں عموماً ہوتا یہ ہے کہ میک اپ سے لتھڑے چہروں والی خواتین اور سوٹڈ بوٹڈ، دھلے دھلائے حضرات جمع ہوتے ہیں۔ پھر انہی جیسا کوئی ٹرینر یا سپیکر نمودار ہوتا ہے اور نیم غلط اردو اور انگلش میں لہجہ بگاڑ بگاڑ کر گفتگو کرتا ہے جس میں ,Passion

Productivity, Innovative, Creative, Out-of-the-box, Change اور اس سے ملتے جلتے کچھ الفاظ لازمی شامل ہوتے ہیں۔ حاضرین تالیاں بجاتے ہیں اور سب اتفاق کرتے ہیں کہ بڑی ''ایفیکٹو'' ٹریننگ تھی۔ تھوڑی دیر بعد چائے کے دوران یہی ''کامیاب'' اور ''اپنی قسمت کے خود مالک'' خواتین و حضرات بشمول ٹرینر صاحب یا صاحبہ ایک دوسرے کے ساتھ ''سیٹھ کلچر'' سے لے کر مہنگائی تک ہر چیز کا رونا رو رہے ہوتے ہیں۔

لطف یہ ہے کہ ایسے ٹرینر حضرات سے کبھی الگ، آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہو تو فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ جن موضوعات کے ایکسپرٹ ہونے کے دعویدار ہیں ان کے متعلق انکا علم بہت سطحی نوعیت کا ہے اور انہیں ان چیزوں کے پیچھے کارفرما منطق اور نظریات اور مجموعی معاشی تناظر میں ان چیزوں کے حقیقی مقام کا نہ صرف یہ کہ کوئی علم نہیں ہے بلکہ ان میں ایسی کسی چیز کو سمجھنے کی قابلیت یا خواہش بھی سرے سے موجود نہیں ہے۔

Success لٹریچر سے بیزاری

اس طرح کے تجربات و مشاہدات اور تلخیٔ ایام نے مل جل کر اس لٹریچر اور عمومی مشورہ کاروں (جو ذاتی سے لے کر کاروباری کامیابی تک ہر چیز کی ''کنجیاں'' بانٹتے پھرتے ہیں) کیلئے طبعیت میں اتنا نفور پیدا کر دیا کہ کوئی بات جس سے رجائیت کی ذرا سی بھی بو آتی ہو میرے لیے سننا یا برداشت کرنا ناممکن ہو گیا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کسی نے گفتگو کے دوران مجھے ''منفی سوچوں'' کو چھوڑ کر ''مثبت سوچ'' اپنانے کی نصیحت کی تو دامنِ اخلاق بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

لوگ اپنی صلاحیت، افتاد طبع اور پسند سے قطعِ نظر، محض "معمولی" کی گالی سے بچنے کیلئے "غیر معمولی" انسانوں جیسا بننا چاہتے ہیں اور جب نہیں بن پاتے تو اپنی ہی نظروں میں گر جاتے ہیں، وہ Self Esteem کھودیتے ہیں اور ڈپریشن کا شکار ہوجاتے ہیں۔

اب اس طرح کا جذباتی نفور تو باقی نہیں رہا لیکن میں سنجیدگی سے یقین رکھتا ہوں کہ اس لٹریچر کا بیشتر حصہ مکمل جھوٹ یا کم از کم مبالغے پر ضرور مبنی ہے اور اس سے بہت زیادہ تعرض یا اس پر یقین متعدد پہلوؤں سے نقصان کا باعث ہوسکتا ہے۔ آئندہ ابواب میں اس لٹریچر اور ان Speakers کے ایسے ہی مبالغہ آمیز دعووں اور ممکنہ نقصانات پر گفتگو ہوگی۔

کامیابی کا تصور

موٹیویشنل سپیکرز کامیابی کے گُر ضرور بتاتے ہیں لیکن کامیابی کی کوئی مخصوص تعریف نہیں کرتے۔ اگر آپ ان سے پوچھیں تو ان میں سے کچھ یہ بھی کہہ دیں گے کہ کامیابی کے مختلف لوگوں کے لیے مختلف معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جو مثالیں وہ دیتے ہیں اور کامیابی کے جو گر بتاتے ہیں اس سے بالواسطہ طور پر کامیابی کا صرف ایک ہی طرح کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ یہ تصور ان لوگوں نے ہی پیدا کیا ہے کیونکہ یہ تصور انکے پروفیشن کے جنم سے پہلے ہی معاشرے میں بالعموم رائج ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن اس تصور کو ذہنوں میں مزید راسخ کرنے کی ذمہ داری کسی حد تک ان لوگوں پر ضرور عائد ہوتی ہے۔

کامیابی کا مقبول تصور

یہ تصور کیا ہے اسے سمجھنے کیلئے اس پر غور کیجئے کہ ''کامیاب انسان'' کی دو لفظی ترکیب سن کر یا پڑھ کر آپ کے ذہن میں کیا تصور ابھرتا ہے۔ اکثر لوگوں کے ذہن میں بل گیٹس، سٹیو جابز اور میاں منشا جیسے نام آئیں گے۔ کچھ لوگوں کے ذہن میں باراک اوبامہ، اے پی جے عبدلکلام، ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا تصور ابھرے گا۔ بہت کم (ایک یا دو فیصد) کے ذہن میں شاید مدر ٹریسا یا عبدالستار ایدھی کا نام بھی آئے۔ تاہم ایک بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کسی کے ذہن میں بھی سرحد پر وطن کی حفاظت کے جذبے میں جان سے گذر جانے والے کسی گمنام سپاہی، کسی دور دراز دیہات میں ساری زندگی عبادت سمجھ کر بچوں کو پڑھانے اور اس پر فخر کرنے والے استاد، عمر بھر مزدوری یا کلر کی کر کے اپنے بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا کرتے اور آخری عمر میں ان کی شادیاں اور بچے دیکھ کر خوشی سے نہال ہوتے خمیدہ کمر بوڑھے یا کسی ایسے پڑھے لکھے

شخص، جس نے اپنا کیریئر چھوڑ چھاڑ کر کسی مسجد کی امامت سنبھال لی ہے اور اب قناعت کی زندگی بسر کر رہا ہے اور روح کی گہرائیوں تک مطمئن ہے کا تصور پیدا نہیں ہوگا کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ناکام نہیں بھی تو کم از کم معمولی ضرور سمجھا جاتا ہے۔

اب آپ ان چاروں کیٹگر یز کی خصوصیات پر غور کریں:

پہلی کیٹیگری: دولت، شہرت

دوسری کیٹیگری: حالات سے لڑ کر اپنی کمیونٹی، ملک یا قوم کیلئے کوئی کارنامہ، شہرت

تیسری کیٹیگری: انسانیت کی بے لوث خدمت، شہرت

چوتھی کیٹیگری: اطمینان، خوشی

ہمارے موٹیویشنل سپیکرز حضرات ان میں سے پہلی تینوں کیٹیگر یز (خاص طور پر پہلی دو) کے لوگوں کو ہی دولت اور/ یا شہرت کی بنیاد پر غیر معمولی اور کامیاب سمجھتے ہیں اور ہمیں ان جیسا ہی بننے کی پوری شدومد کے ساتھ تلقین کرنے اور ترغیب دلانے کے ساتھ ساتھ "معمولی" اور "ناکام" لوگوں (یعنی جن کے پاس دولت اور شہرت نہیں ہے) کی تحقیر کرتے ہوئے ان میں شامل نہ ہونے کی نصیحت بھی کرتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو موٹیویشنل سپیکرز مختلف طریقوں سے اسی تصورِ کامیابی کو فروغ دیتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ تو مشہور اور امیر لوگوں کی مثالیں بیان کرنا ہے لیکن اس سے بھی موثر طریقہ خود اپنی مثال پیش کرنا ہے۔ مثلاً عالمی شہرت یافتہ موٹیویشنل سپیکر انتھونی روبنز Anthany Robbins سے لوگوں کے متاثر ہونے کی بڑی وجہ اس کی اپنی کہانی ہے کہ کس طرح وہ ایک کچرا صاف کرنے والا ہوتا تھا اور اب وہ دنیا کے امیر اور مشہور ترین لوگوں میں شامل ہے۔ برائن ٹریسی بھی بڑے اہتمام سے بار بار اپنی ابتدائی غربت کا بڑا رقت انگیز نقشہ کھینچتا اور موجودہ دولت و ثروت کا ذکر کرتا ہے۔ بلکہ ٹریسی کے انٹرنیٹ پر اپنے ادارے کے اشتہارات کی ٹیگ لائن Tag Line ہی کچھ یوں ہے: Ability To Earn Is Your

Greatest Asset (کمانے کی صلاحیت آپکا سب سے بڑا اثاثہ ہے)۔

ہمارے اپنے ملک میں ایک امریکہ پلٹ سپیکر اور رائٹر، جو غالباً پاکستان میں اس پیشے کے بانیوں میں سے ہیں، بھی بار بار اپنی ہی کہانی بیان کرتے ہیں۔ انکی سات زبانوں میں ترجمہ ہونے والی کتاب انکی اپنی ہی کہانی پر مبنی ہے۔ اسی طرح ہمارے ہی ملک کے ایک اور رائٹر اور سپیکر جن کی ویب سائٹ پر Pakistan's Premium Motivational Speaker لکھا ہوا ہے، بھی ہمیشہ پہلے ایک بہت غریب بچے کی کہانی بیان کرتے ہیں جس کے پاس آج بہت دولت ہے اور پھر بتاتے ہیں کہ یہ انکی اپنی کہانی ہے۔ انکی ایک کتاب کے نام میں ہی Dollars آتا ہے۔

معمولی اور غیر معمولی لوگ

غرضیکہ مختلف طریقوں سے دولت اور شہرت کے کامیابی کا معیار ہونے کے تصور کی تائید کی جاتی ہے اور انہی دو چیزوں کے حامل ''غیر معمولی'' انسانوں کی ایسی مدح و تحسین اور ''معمولی'' انسانوں کی ایسی تحقیر کی جاتی ہے کہ ''معمولی'' کا لفظ گالی محسوس ہونے لگتا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ انسانوں کی عظیم ترین اکثریت اسی چوتھی یعنی ''معمولی انسانوں'' کی کیٹیگری سے تعلق رکھتی ہے اور ایسا نہ پہلے کبھی ہوا ہے کہ اور نہ ہی آئندہ ہونا ممکن نظر آتا ہے کہ انسانوں کی اکثریت پہلی تین کیٹگریز میں چلی جائے۔ اب لوگ اس سے قطعِ نظر کہ ان میں کیا صلاحیت ہے، انکی افتادِ طبع کیسی ہے یا انہیں کس چیز میں خوشی ملتی ہے، محض ''معمولی'' کی گالی سے بچنے کیلئے انہی ''غیر معمولی'' انسانوں جیسا بننا چاہتے ہیں اور جب نہیں بن پاتے تو اپنی ہی نظروں میں گر جاتے ہیں، وہ Self Esteem کھو دیتے ہیں اور ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

کامیابی کے معرف تصور اور Success Literature کے ناخوشگوار نتائج

Low Self Esteem اور Depression اب دنیا میں باقاعدہ وبا (Epidemic) کی صورت

اختیار کر چکے ہیں اور ایسا کلی طور پر نہیں تو بھی بہت حد تک کامیابی کے اسی غلط تصور کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک ستم ظریفی ہے کہ سیلف ہیلپ اور موٹیویشنل سپیکنگ جن چیزوں کے علاج کی دعویدار ہیں اصل میں انہی کو بڑھانے کا موجب بنی ہوئی ہیں۔ اس حقیقت کو Self help inc: Makeover Culture in American Life کی مصنفہ نے بڑی خوبصورتی سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> Although Americans turn to self-improvement literature for inspiration in times of despair, for specific advice on how to conduct their lives, and for reassurance in the face of enormous social, political, and economic changes, paradoxically this literature may foster, rather than quell, their anxieties. The proliferation of self-improvement discourse —in magazines, newspapers, tabloids, talk shows, bookstores, and internet sites— may have consequences not unlike the rise of advertising in the early twentieth century. Just as the emergence of consumer advertising fostered social anxiety by focusing on an array of supposedly embarrassing corporeal "problems" such as halitosis or dandruff —problems that could be addressed through the purchase of various toiletries— today's retinue of self-improvement experts,

---

جیسے ایڈورٹائزنگ خشکی اور بدبودار سانسوں جیسے کچھ بظاہر خجالت انگیز جسمانی "مسائل" کو حل کرنے والی مصنوعات کی تشہیر کے نتیجے میں انہی "مسائل" کو نمایاں کرکے ایک طرح کے سماجی اضطراب کا باعث بنی تھی اسی طرح آج سیلف ہیلپ گروز اور موٹیویشنل سپیکرز کی فوج عوام میں ایک لامتناہی کمی کے احساس کو جنم دے رہی ہے۔

motivational speakers, and self-help gurus conjure the image of endless insufficiency.

اگرچہ امریکی عوام نومیدی و یاس سے چھٹکارے، زندگی گزارنے کے بہتر طریقے جاننے اور بڑی سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کے دور میں حوصلہ افزائی کیلیے تحسینِ ذات کے متعلق مواد کی طرف رجوع کرتے ہیں مگر اسے ستم ظریفی کہیے کہ یہ مواد ان کی پریشانیوں کو کم کرنے کے بجائے انہیں سوا کرنے کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ تحسینِ ذات کے متعلق جو مباحث اخباروں، میگزینز، ٹاک شوز، بک سٹورز اور انٹرنیٹ کے ذریعے پھیل رہے ہیں ان کے اثرات قریب قریب ویسے ہی ہو سکتے ہیں جو بیسویں صدی کے آغاز میں ایڈورٹائزنگ کے عروج کے ہوئے تھے۔ جیسے ایڈورٹائزنگ خشکی اور بدبودار سانسوں جیسے کچھ بظاہر خجالت انگیز جسمانی ''مسائل'' کو حل کرنے والی مصنوعات کی تشہیر کرنے کے نتیجے میں انہی ''مسائل'' کو نمایاں کر کے ایک طرح کے سماجی اضطراب کا باعث بنی تھی اسی طرح آج تحسینِ ذات کے ماہرین، سیلف ہیلپ گروز اور موٹیویشنل سپیکرز کی فوج عوام میں ایک لامتناہی کمی کے احساس کو جنم دے رہی ہے۔

(یہاں اس چیز کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک دلچسپ تحقیق کے نتائج سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص Low Self Esteem کا شکار ہو اور وہ اپنے بارے میں خوش کن باتیں کر کے اسے بڑھانے کی کوشش کرے تو اسکا Self Esteem مزید کم ہو جاتا ہے)

ایک بے غرض استاد کی مثال

اسکے برعکس اب ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ میرے لئے Godfather کی حیثیت رکھنے والے میرے استاد پروفیسر شیخ محمد رفیق کی کہانی یہ ہے کہ استاد بننے کے شوق میں انجینئرنگ کو ٹھوکر ماری، پروفیسر بنے اور ساری زندگی بچے پڑھانے سے زیادہ پالے۔ جس پہلے یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھا وہ چند سال پہلے آئی جی ریٹائر

ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب کے چشمہ عنایت سے فیض یاب ہونے والا وہ اکیلا نہیں ہے۔ درجنوں سے تو میں ملا ہوں، سینکڑوں اور ہیں۔ ان سب کی کہانیاں ایک جیسی ہیں اور یہ احساس بھی مشترک ہے کہ ان کی ذات اور شخصیت پر پروفیسر صاحب کی عنایات اور تربیت کے نقوش انمٹ ہیں۔ اپنے طالب علموں کی مدد کیلئے ان کے کالج سے فارغ ہوجانے کے بعد بھی میں نے انہیں جس حد تک جاتے دیکھا ہے اس کو بیان کروں تو کسی کو یقین نہ آئے۔

وہ بچے جو صرف پروفیسر صاحب کی وجہ سے تعلیم حاصل کر پائے آج بڑے بڑے عہدوں پر ہیں لیکن پروفیسر صاحب خود ایک اوسط سے گھر میں رہتے ہیں اور ان کے پاس ایک کھٹارا سی گاڑی ہے۔ ان کے اکاؤنٹ میں چند ہزار روپوں سے زیادہ کبھی نہیں ہوتے غرضیکہ وہ بالکل "معمولی" آدمی ہیں۔ لیکن ان کے پاس جائیں تو ان کی بات چیت سے لے کر اٹھنے بیٹھنے تک ہر چیز سے ایسا سکون ٹپکتا ہے کہ اسکی تاب لانا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور جب مذکورہ بالا بچوں میں سے کسی کا ذکر آتا ہے تو ان کی ذات پر تنی سکون کی چادریں یک لخت کئی گنا دبیز ہوجاتی ہیں۔ کیا پروفیسر صاحب بغیر دولت اور شہرت کے بھی ایک کامیاب انسان نہیں؟

روحانیت کا تڑکا

پروفیسر صاحب کی مثال اور اس سے قبل کی بحث سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ کامیابی کا مادی تصور نہ صرف یہ کہ عالمگیر نہیں ہے کہ بلکہ متعدد خرابیوں کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ غالباً اسی کمزوری کے احساس کے نتیجہ ہے کہ اگرچہ بہت سارے سپیکرز اور رائٹرز اب بھی اسی تصور کا ہی بالواسطہ یا بلاواسطہ پرچار کر رہے ہیں لیکن اب بالعموم کامیابی کے لٹریچر میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی ہے اور وہ ہے روحانیت کی۔

اس جہت کا ظہور کئی شکلوں میں ہوا ہے جن میں سب سے واضح فرد کی اپنی ذات کی مرکزیت، اسکی دریافت اور اپنی زندگی میں معنی کی تخلیق پر زور ہے۔ تکمیلِ ذات اب Success Literature کا غالب ترین Theme ہے۔ اکثر سپیکرز اور رائٹرز آپکو اپنے من میں ڈوبنے، اپنی معرفت کے حصول، اپنے Passion

کی پہچان اور پھر سب چھوڑ چھاڑ اسی کے تعاقب میں نکل کھڑے ہونے کا درس دیتے نظر آئیں گے۔ ان کے ہاں اپنے من کے سمندر کی غوطہ خوری اگر مکمل نہیں تو کم از کم ایک نیم روحانی نیم مقدس تجربے کے طور پر ضرور سامنے آتی ہے۔

لیکن Success Literature کی واضح تر روحانی (اگرچہ بڑی حد تک غیر مذہبی) جہت اس کے بعد نفسیات، کوانٹم فزکس اور مذہبی تصورات کے ایک عجیب وغریب ملغوبے کی صورت میں سامنے آتی ہے اور کبھی نیورو لنگوسٹک پروگرامنگ، کبھی یوگا تو کبھی نام نہاد لاء آف اٹریکشن کی شکل اختیار کرتی ہے۔

تصور یہ ہے کہ اپنے Passion کو جان لینے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے تعاقب میں نکل کھڑے ہونے کے بعد آپکو اپنے ذہن کو (خصوصاً تحت الشعور کو) تسخیر کر کے اسکی لامحدود طاقت کو آزاد کرنا ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد آپکا ذہن پوری کائنات کو آپکی خواہشوں کی تکمیل پر لگا دے گا۔

اگرچہ ساری طاقت کے انسان کے اپنے اندر ہی مرتکز ہونے کے نظریے میں بہت کشش ہے مگر نہ صرف ذہن کی طاقت کے متعلق اس طرح کے دعوے بالکل مضحکہ خیز اور کسی بھی قسم کی علمی بنیادوں سے محروم ہیں بلکہ یہ انفرادیت کو معاشرے کیلئے تباہ کن سطح تک لے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک عام ادھیڑ عمر ملازمت پیشہ آدمی اپنے Passion کی تکمیل کیلئے سب چھوڑ چھاڑ کر نکل کھڑا ہو تو ہوسکتا ہے وہ اپنی خاندان کی ذمہ داریاں پورا کرنے کے قابل نہ رہے۔ (انسان کی سوچ اور اسکے حالت کے باہمی تعلق اور انسان کے اپنی حالت کے خود ذمہ دار ہونے پر تفصیلی گفتگو اگلے باب میں ہوگی)۔

ڈاکٹر سٹیفن کاوی Stephen Covey اور مذہب کا افادی نظریہ

Success Literature میں روحانیت کی نسبتاً زیادہ مذہبی جہت کو متعارف کروانے کا سہرا اسٹیفن کاوی کے سر ہے۔ ڈاکٹر کاوی نے اپنی کتاب Seven Habits of Highly Effective People کے ذریعے بہت شہرت کمائی ہے۔ ڈاکٹر کاوی اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انہوں نے ٹوٹکوں کے بجائے آفاقی

اصولوں کے اختیار کے ذریعے کامیابی کے حصول کا فارمولا پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جو عام سیلف ہیلپ لٹریچر سے وحشت محسوس کرتے ہیں اور مذہبی لوگ بھی ان کی کتاب سے متاثر ہوئے ہیں (میری نظر سے ایک پورا مقالہ گزرا ہے جس میں ڈاکٹر کوی کے فارمولے کو "اسلام کے عین مطابق" قرار دیا گیا ہے۔ یہ چلن بھی بہت عام ہو گیا ہے کہ جوں ہی کوئی چیز قبولیت حاصل کرنے لگتی ہے کچھ لوگ اسے جھٹ سے "اسلام کے عین مطابق" قرار دینے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ ایک قابلِ مذمت رویہ ہے)۔

میرے نزدیک ان کا نظریہ بھی اپنے تباہ کن اثرات کے لحاظ سے عام سیلف ہیلپ لٹریچر سے مختلف نہیں۔ بلکہ کچھ لحاظ سے یہ خطرناک تر ہے۔ یہ دراصل مذہب/ اخلاق کے افادی نظریے کا ایک انتہائی ظہور ہے جس کے تحت آپ مذہبی/ اخلاقی اصولوں کو بھی اس لیے اختیار نہیں کرتے کہ بطور انسان آپکو انہیں اختیار کرنا چاہیے بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے دنیاوی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اس جذبے کے تحت اختیار کیے جانے والے اخلاق بہت کھوکھلے اور محض نمائشی و تبلیغی نوعیت کے ہوتے ہیں جو انسانی شخصیت میں کسی حقیقی تبدیلی کے بجائے اسے اور زیادہ مصنوعی، کھوکھلا اور بے وقعت بنا دیتے ہیں۔

روحانیت کی سب سے زیادہ مذہبی شکل وہ ہے جو غالباً صرف ہمارے ہی ملک میں پائی جاتی ہے۔ اس میں سپیکر اور رائٹر حضرات قرآن اور حدیث سے کچھ چیزیں اٹھاتے ہیں اور کھینچ کھانچ کر ان سے Success Literature کے مختلف تصورات کی تائید مہیا کرتے ہیں تاکہ مذہبی جذبات کو اپیل کر کے بات منوائی جا سکے۔ یہ رویہ قطعی غیر علمی اور مذہبی لٹریچر کے فہم میں رکاوٹ بننے کے علاوہ اپنے فائدے کیلئے قرآن و حدیث کا غلط استعمال ہونے کے لحاظ سے بھی قابلِ مذمت ہے۔

یہ چلن بھی بہت عام ہوگیا ہے کہ جوں ہی کوئی چیز قبولیت حاصل کرنے لگتی ہے کچھ لوگ اسے جھٹ سے "اسلام کے عین مطابق" قرار دینے نکل کھڑے ہوتے ہیں، یہ اپنی جگہ ایک قابلِ مذمت رویہ ہے۔
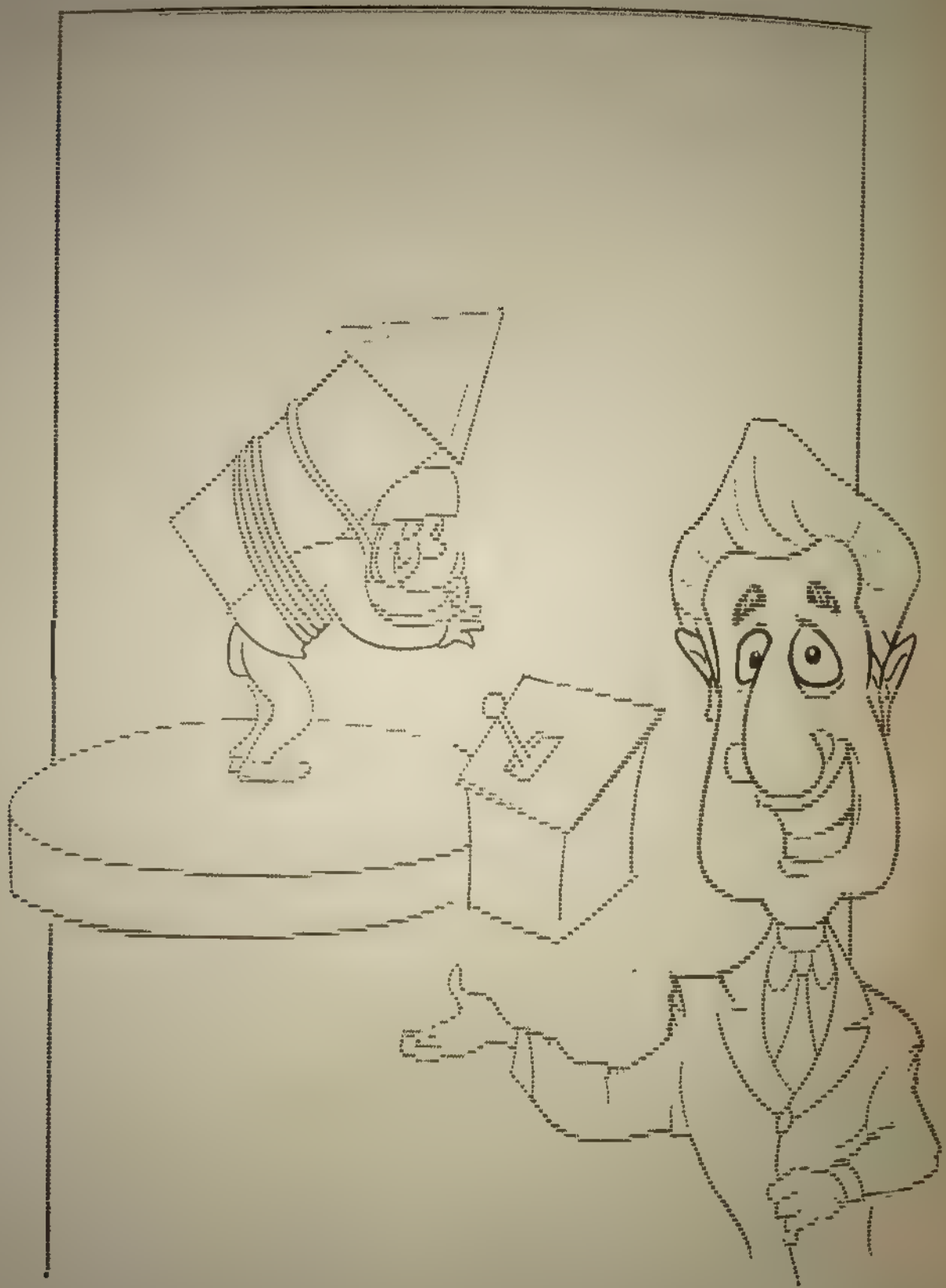
کامیابی کا آفاقی (یونیورسل) تصور

حاصل کلام یہ کہ سیلف ہیلپ لٹریچر میں کامیابی کے معروف تصورات چاہے کھلم کھلا مادیت پر مبنی ہوں یا روحانیت کے بھیس میں، ہر دو صورتوں میں غیر متوازن اور مضبوط علمی بنیادوں یا کسی حقیقی، اعلیٰ انسانی اور اخلاقی آئیڈیلز سے محروم ہیں۔

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ پھر کامیابی کے کس قسم کے تصور کا پرچار کیا جائے؟ میری رائے میں کامیابی کے کسی یونیورسل تصور کا خیال ہی عبث ہے اور ایک ہی طرح کا کوئی تصور زورِ خطابت کے ذریعے سب پر ٹھونس کر متنوع مزاجوں کے حامل انسانوں کو انکے فطری راستوں سے بھٹکا کے کسی خاص راستے پر چلانے کی کوشش کرنا قابلِ مذمت اور نتائج کے اعتبار سے خطرناک ہے۔ اسی طرح میری رائے میں یہ خیال بھی مضحکہ خیز ہے کہ کوئی ایسا Success Coach بھی ہوسکتا ہے جو ہر مزاج اور ہر پروفیشن کے آدمی کو کامیابی کے گر بتائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی کسی ایک مخصوص پروفیشن میں کامیابی کے متعلق لوگوں کی راہنمائی کردے۔ عمومی طور پر صرف اعلیٰ انسانی اقدار کا پرچار ہی کیا جانا چاہیے۔

قسمت کا کردار

مروجہ Success Literature کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ہے کہ انسان اپنی قسمت کا خود مالک ہے اور اپنی کامیابی یا ناکامی کا خود ہی ذمہ دار ہے۔ مثال کے طور پر Matthias Schmelz سے منسوب یہ جملہ آپ کو اکثر موٹیویشنل سپیکرز سے سننے کو ملے گا:

THERE ARE NO WINNERS OR LOSERS IN LIFE, ONLY CHOOSERS.

یعنی کہ کامیابی یا ناکامی کا انتخاب انسان خود کرتا ہے نہ کہ اس کی قسمت یا حالات۔ یہی وجہ ہے کہ Success Literature میں Self Made انسان کو آئیڈیل کی حیثیت حاصل ہے۔ موٹیویشنل سپیکرز ایسے لوگوں کی مثالیں دے کر لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ فیصلہ کر لیں کہ انہیں اپنی زندگی بدلنی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں روک نہیں سکتی۔ بل گیٹس سے منسوب یہ جملہ بھی بار بار دہرایا جاتا ہے کہ "غریب پیدا ہونے میں آپکا کوئی قصور نہیں لیکن اگر آپ غریب ہی مر جاتے ہیں تو یہ سراسر آپ کا اپنا قصور ہے"۔

بہتر ہو گا کہ میں یہاں ایک موٹیویشنل سپیکر کے الفاظ میں ہی ان کا نظریہ بیان کر دوں۔ فائز ایچ سیال اپنی مشہور کتاب "شاہراہِ کامیابی" میں لکھتے ہیں:

> کامیابی کے بارے میں ایک اور عام غلط فہمی یہ ہے کہ اگر کامیابی حاصل کرنا ایسا فن ہے جسے سیکھا جا سکتا ہے تو ہر کوئی کامیاب کیوں نہیں ہو جاتا۔ میں دوبارہ آپ کو اپنی تحقیق کا حوالہ دوں گا۔ ستانوے فیصد لوگ اس بات سے آگاہ نہیں ہیں کہ کامیابی حاصل کرنا ان کے اپنے اختیار میں ہے۔

موٹیویشنل سپیکرز اور تحقیق

برسبیلِ تذکرہ، مجھے سیال صاحب کی تحقیق یا اس کے نتائج پر کوئی شبہ نہیں لیکن موٹیویشنل سپیکرز جب کسی تحقیق کا ذکر کریں تو ذرا محتاط ہو جانا چاہیے۔ ان کے ہاں بیان کی جانے والی "تحقیقات" کی نوعیت سمجھانے کیلئے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ کا واسطہ بھی کامیابی کے گر بتانے والے کسی موٹیویشنل سپیکر سے پڑا ہے تو بہت امکان ہے کہ اس نے کامیابی کے حصول کیلئے Goals بنانے اور لکھنے کا مشورہ ضرور دیا ہوگا اور ننانوے فیصد امکان ہے کہ اس "ریسرچ" کا حوالہ بھی دیا ہوگا جو نصف صدی قبل ایک امریکی یونیورسٹی میں ہوئی جس میں طلبہ سے پوچھا گیا کہ کیا انہوں نے اپنے Goals لکھے ہوئے تو معلوم ہوا کہ صرف تین فیصد نے ایسا کیا ہے۔ بیس سال بعد ان طلبہ سے دوبارہ رابطہ کیا گیا تو پتا یہ چلا کہ جن تین فیصد نے اپنے گولز لکھے ہوئے تھے ان کے پاس باقی ستانوے فیصد کی کل دولت سے زیادہ دولت تھی۔

Anthony Robbins اور Zig Ziglar جیسے عالمی شہرت یافتہ گروز سے لے کر ہمارے گلی کوچوں میں خودرو کھمبیوں کی طرح اگ آنے والے مقررین و "ماہرین" تک ہر کوئی اسی ریسرچ کا ڈھول پیٹتا نظر آتا ہے۔ (ہم نے پہلی مرتبہ اس ریسرچ کا ذکر ایک بہت مشہور ماہر نفسیات اور پارٹ ٹائم موٹیویشنل سپیکر کے منہ سے کالج کے پہلے سال کے دوران اس وقت سنا جب وہ لیکچر دینے تشریف لائے تھے) تاہم یہ ایک بالکل لغو قصہ ہے۔ اس قسم کی کوئی ریسرچ سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ 1996 میں فاسٹ کمپنی میگزین نے اس "تحقیق" کو کھوجنا شروع کیا تو زیگلر، روبنز اور ٹریسی سمیت سبھی یہ بتانے میں ناکام رہے کہ یہ تحقیق کس نے کی اور اس کے نتائج کہاں شائع ہوئے۔ فاسٹ کمپنی نے اس کے بعد Yale یونیورسٹی سے رابطہ کیا جہاں مبینہ طور پر یہ تحقیق ہوئی تھی تو انہوں نے بھی تصدیق کی کہ وہ کسی بھی ایسی ریسرچ کے وجود سے ناواقف ہیں۔

کامیابی میں حالات کے کردار کا انکار

بازآمدم برسر مطلب۔ فائز صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

> پانچ سو سے زائد ملکی اور غیر ملکی کامیاب افراد کی زندگیوں کے بارے میں کیا گیا میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان میں نوے فیصد سے زائد افراد وہ تھے جو معاشرے کے پسماندہ طبقے میں پیدا ہوئے پلے بڑھے اور انہوں نے حقیقتاً اپنے پاس کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بڑی کامیابی حاصل کی۔

فی الحال اس تحقیق کی صحت کے متعلق میں کوئی سوال نہیں اٹھا رہا کیونکہ مقصود صرف موٹیویشنل سپیکرز کے تصور کو واضح کرنا ہے کہ وہ انسان کی کامیابی میں حالات کے کردار سے منکر ہیں اور اسے صرف انسان کے اپنے انتخاب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ الگ سمجھے جانے والے اسٹیفن کاوی کا مقدمہ بھی یہی ہے۔ وہ آغاز میں ہی زور دے کر کہتا ہے کہ سب سے پہلے آپ تسلیم کریں کہ آج آپ جیسے بھی ہیں اس کے ذمہ دار آپ خود ہی ہیں اور خود کو بدلنے کی ذمہ داری بھی آپ کی ہی ہے۔ یہ ذمہ داری قبول کرنے کے بعد آپ اس کی بتائی ہوئی عادات کو اپنا کر اپنی زندگی بدل سکتے ہیں۔

موٹیویشنل سپیکرز کے بقول خود اعتمادی کے فقدان اور خوف کی وجہ سے اکثر لوگ تمام عمر قسمت اور حالات کو کوستے رہتے ہیں حالاں کہ وہ چاہیں تو اپنے حالات بدل سکتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے خود اعتمادی کو بڑھانے اور خوف کو دور کرنے والی ''ٹیکنیکس'' بھی ایجاد کر رکھی ہیں۔ مثلاً ٹونی روبنز لوگوں کو جلتے ہوئے

قسمت کے مالک ہونے کا نظریہ، فحش ہونے کی حد تک کسی بلند تر اجتماعی انسانی آئیڈیل سے خالی اور مذہبی تصورات و اخلاقی آئیڈیلز سے بھی براہ راست متصادم ہے۔

کوئلوں پر چلا کر ان کا خوف دور کرتا اور اعتماد بڑھاتا ہے۔

انسان کے اپنی قسمت کے مالک ہونے کے نظریے کی بنیادیں

اس بحث سے قبل کہ کیا انسان واقعی اپنی قسمت کا مالک ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بات اس پر کی جائے کہ یہ تصور مقبول کیسے ہوا۔ اگرچہ یہ تصور قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے لیکن اس کو مقبولیت اور ایک عقیدے کی سی حیثیت دراصل سرمایہ داری، جمہوریت (حریت ومساوات) اور مادیت کے عروج کے نتیجے میں اخروی انصاف کے مذہبی تصور کے مقابلے میں فوری اور مکمل دنیاوی انصاف کے آئیڈیل کے طور پر حاصل ہوئی جسے پھر امریکی استثنائیت کے جذبے (American Exceptionalism) نے انتہا تک پہنچادیا۔

اسی چیز کو Heike Paul نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہے:

> In many ways, the notion that individuals can determine their own future and change their lives for the better is a modem idea and presupposes modern notions of culture, society, and the individual along the lines of Immanuel Kant's enlightenment dictum that man will be 'what he makes of himself', which later, in Sartre's reformulation, becomes "[m]an is nothing else but what he makes of himself". This notion is the result of large-scale and complex processes of secularization that are quite at odds with Christian ethics, as it often flaunts competition, self-help, and ambition as its driving forces: "The competitive society out of which the success myth and the self-made man have grown may accept the Christian virtues in principle but can hardly observe them in practice".

This connection —or rather disjunction— of ethics, ambition, and success plays out in culturally specific ways. In the present context, the idea of personal success is closely linked to processes of nation-building. The "pursuit of happiness" (as famously formulated in the Declaration of Independence) and the "promise of American life" in their early exceptionalist logic transfer notions of happiness from the afterlife to one's earthly existence. i.e. to the present moment or at least the near future. Coupled with the Calvinist work ethic, the pursuit of happiness constructs the modern individual's path to happiness as the pursuit of property and allows for self-realization in new ways. This notion has already been at the center of 18th century 'new world' promotional literature, which touted America as an earthly paradise. The self-made man as a foundational mythical figure personifies this promotional discourse, and has been used to allegorize the 'new world' social order since the late 18thand throughout the 19th century.

یہ تصور کہ انسان اپنے مستقبل کا خود تعین کر سکتے ہیں اور اپنی زندگیاں بہتر بنا سکتے ہیں متعدد پہلوؤں سے ایک جدید تصور ہے جسکی بنیاد میں ثقافت، معاشرے اور فرد کے وہ جدید تصورات ہیں جو عمانویل کانٹ کے اس تنویری عقیدے کہ "انسان وہی بنتا ہے جو وہ خود کو بناتا ہے" یا سارترے کے الفاظ میں "انسان اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے جو وہ خود کو بناتا ہے" کے متعین کیے ہوئے خطوط پر وجود میں آئے ہیں۔ یہ تصور مادی تعبیروں کے ایک وسیع اور پیچیدہ عمل کا نتیجہ ہے اور مسابقت، اپنی مدد آپ اور جاہ پرستی کو اپنی قوت ہائے متحرکہ کے طور پر پیش کرنے کے باعث اکثر مسیحی اخلاقیات کے خلاف پڑتا ہے۔

بقول شخصے مسابقت کی بنیاد پر استوار معاشرہ جس سے کامیابی اور خود پرداختگی کے واہمے پھوٹے ہیں اصولی طور پر تو مسیحی اقدار سے متفق ہے لیکن عملی طور پر شاید ہی ان کی پابندی کرسکتا ہو۔

اخلاق، جاہ پرستی اور کامیابی کے ان تصورات کے اتصال یا یوں کہنا چاہیے کہ انفصال سے کچھ مخصوص ثقافتی عادات جنم لیتی ہیں۔ موجودہ تناظر میں ذاتی کامیابی کا تصور قوم سازی کے عمل سے بھی منسلک ہے۔ اعلانِ آزادی میں شامل "خوشی کی جستجو" کے عقیدے اور "امریکی زندگی کا وعدہ" کے تصور میں کارفرما استثنائی منطق نے دراصل خوشی کو آخرت میں حاصل ہونے والے کسی انعام کے بجائے ایک ایسی چیز کا معنی عطا کیا جو اسی حیاتِ دنیوی یا مستقبل قریب میں حاصل کی جاتی ہے۔ یہی تصور پھر کالونسٹ اخلاقیاتِ کار سے مل کر حصولِ مال کو خوشی کے راستے کے طور پر مستحکم کرتا ہے اور تکمیلِ ذات کے بالکل نئے طریقوں کو جواز بخشتا ہے۔ اس تصور کو اٹھارہویں صدی میں ہی "نئی دنیا" کی تشہیری مہم میں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اور خود پرداختہ آدمی کے بنیادی تصور میں گویا اس تشہیری مہم کے سارے ہی تصورات سمٹ آئے ہیں اور اسے اٹھارہویں صدی سے شروع ہوکر پوری انیسویں صدی کے دوران مسلسل "نئی دنیا" کے مجوزہ سماجی نظام کیلئے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

(اس تصور کی فلسفیانہ بنیادوں، تاریخی ارتقاء، اس کے سیلف ہیلپ کے ساتھ تعلق اور اس میں روحانیت کے تازہ تڑکے کی وجوہات کے موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے Heike Paul کی The Myths That Made America اور Caitlin A. Forsey کے پی ایچ ڈی کے مقالے How to Become an Advice Guru: The New Age Spirit of Entrepreneurial Selfhood میں یہ مباحث دیکھ سکتے ہیں۔)
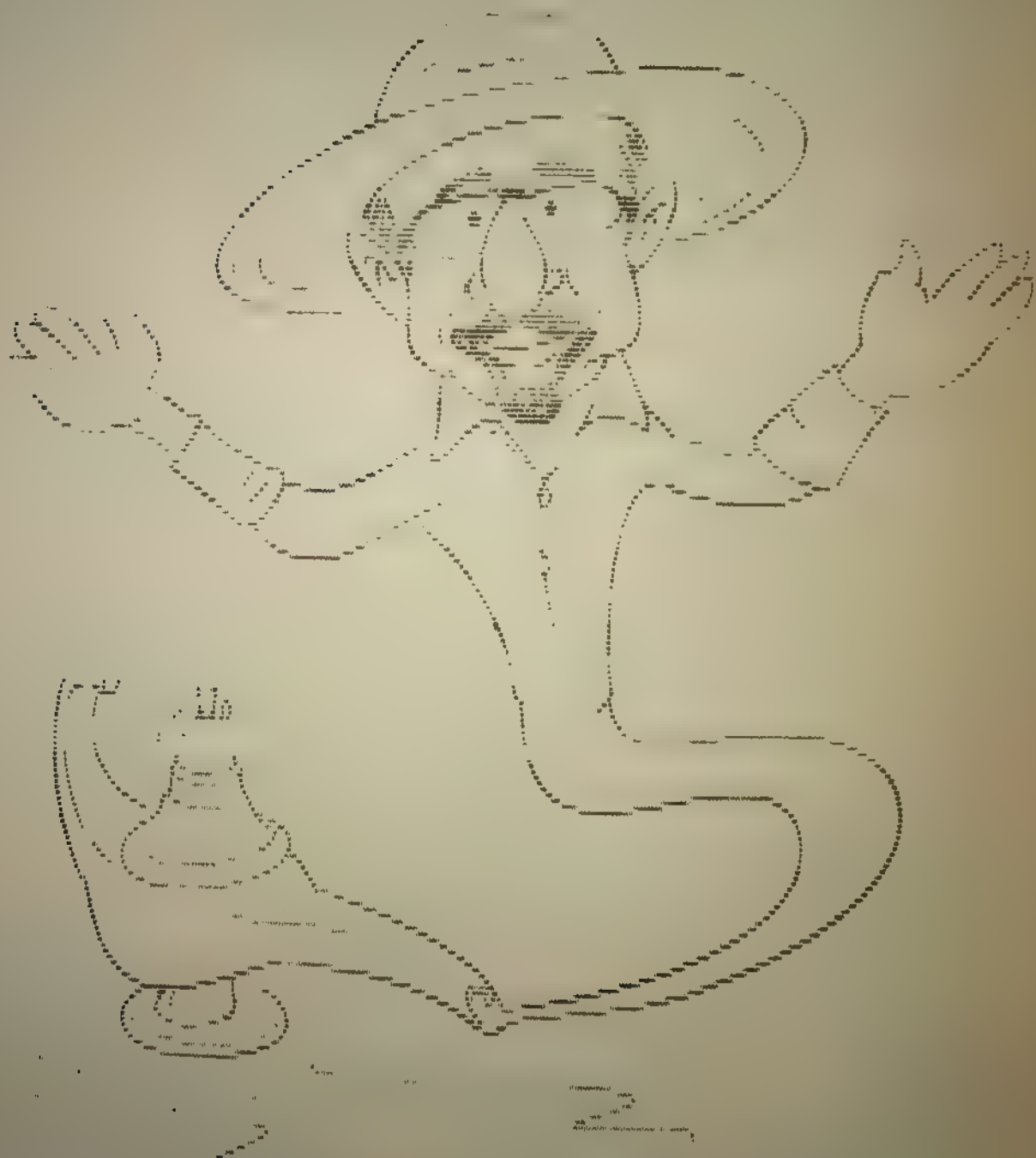
قسمت کے مالک ہونے کے نظریے کی بلند تر انسانی آئیڈیلز سے محرومی

یہ نظریہ فحش ہونے کی حد تک کسی بلند تر اجتماعی انسانی آئیڈیل سے خالی ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی تصورات واخلاقی آئیڈیلز سے بھی براہِ راست متصادم ہے۔ یہ تو درست ہے کہ یہ تصور کہ "کسی شخص کو جو بھی کامیابی ملتی ہے وہ اس کی اپنی منصوبہ بندی، لیاقت اور محنت کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس میں قسمت یا حالات کا کوئی دخل نہیں ہوتا" بدحالی کے شکار افراد کو حوصلہ دے کر ان کو جدوجہد پر اکسا سکتا ہے مگر پھر اس کے لازمے کے طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو کامیاب نہیں ہوتا وہ بھی اس کا اپنا قصور ہے۔ Micki McGee اسی چیز کو یوں بیان کرتی ہے:

> The figure of the self-made man —and more recently that of the self- made woman—comforts and consoles us, suggesting that vast material, social, and personal success are available to anyone who is willing to work long and hard enough. The fantasy has maintained considerable appeal, despite its troubling corollary: if success is solely the result of one's own efforts, then the responsibility for any failure must necessarily be individual shortcomings or weaknesses.

خود پرداختہ مرد و خواتین کا مثالی تصور اس لحاظ سے ہمیں بہت حوصلہ دیتا ہے کہ عظیم مادی، سماجی اور ذاتی کامیابیاں ہر اس شخص کا انتظار کر رہی ہیں جو لمبے عرصے تک محنت کا راستہ اختیار کرنے پر تیار ہے۔ اس واہمے کا سحر اس کے ایک ناخوشگوار لازمے کے باوجود قائم ہے۔ وہ یہ کہ اگر اپنی کامیابی کا اکیلا ذمہ دار انسان خود ہے تو پھر ناکامی بھی تو لازماً انسان کی اپنی ہی کمی اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہوگی۔

انسان کو اپنی ناکامی اور بدحالی کا ذمہ دار ٹھہرانے کے نظریے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوگا کہ ناکام اور بدحال شخص خود

اپنی نظروں میں گر جائے گا، جس کے نتائج فرد کیلئے بہت مضر ہیں لیکن اس کی ایک دوسری جہت بھی ہے جس میں اس کی اعلیٰ انسانی آئیڈیلز سے تہی دستی بہت کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ ہر کوئی کامیابی اور ناکامی، خوشحالی اور بدحالی کا خود ذمہ دار ہے تو پھر کسی غریب سے ہمدردی کی کوئی وجہ ہی باقی نہیں بچتی۔ کیونکہ اگر وہ غریب ہے تو اسکا اپنا ہی قصور ہے۔ اس سے ہمدردی کاہے کی؟

یہ محض ایک نظری بات نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ایسا ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک کے ایک بہت مشہور کالم نگار اپنے ایک کالم میں Google کے بھارتی نژاد منتظمِ اعلیٰ (CEO) سندر پچائی کی کہانی بڑے پُر تاثر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ کیسے ایک غریب خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود اس نے اتنی ترقی کی ہے کہ دنیا کی کامیاب ترین کمپنیوں میں سے ایک کا CEO بن گیا ہے۔ اس کے بعد وہ ان بے روزگار یا غریب نوجوانوں کا ذکر کرتے ہیں جو اپنی غربت اور محرومی کا ذمہ دار حالات اور حکومتوں کو ٹھہراتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں:

> یہ شخص، یہ سندر راجن پچائی ان سب لوگوں کے لیے پیغام ہے اگر آپ آج گوگل، فیس بک، ٹویٹر، واٹس ایپ، وائبر اور انسٹا گرام کے دور میں بھی غریب ہیں، آپ اگر آج جب دنیا کی 40 فیصد دولت انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبوں میں جا چھپی ہے اور آپ اگر آج جب پوری عالمی کمپنی، ملٹی نیشنل فرم اور انٹرنیشنل برانڈ بنانے کے لیے ایک کمپیوٹر، لیپ ٹاپ یا موبائل فون کافی ہے لیکن آپ اس دور میں بھی غریب، محروم اور دکھی ہیں تو پھر آپ اس دکھ، اس محرومی اور اس غربت کو ڈیزرو کرتے ہیں'' (روزنامہ ایکسپریس، فروری 14، 2016ء)

کالم نگار موصوف اس لحاظ سے داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر وہ بات کہہ دی جو اس نظریے کا منطقی نتیجہ ہے۔ یعنی یہ کہ ''آپ اس دور میں بھی غریب، محروم اور دکھی ہیں تو پھر آپ اس دکھ، اس محرومی اور اس غربت کو ڈیزرو کرتے ہیں''۔ اسکی بنیاد میں کارفرما مغالطوں پر تو آگے چل کر تفصیلی بحث ہوگی لیکن فی

الوقت یہ دکھانا مقصود ہے کہ کس طرح اس نظریے کے نتیجے میں غریبوں کے ساتھ حقارت آمیز سلوک اخلاقی طور پر جائز بلکہ مطلوب بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس مذہبی تصور تو یہ ہے کہ خدا نے اپنی لامحدود حکمت کے تحت امتحان کی غرض سے کسی کو امیر اور کسی کو غریب بنایا ہے۔ کوئی امیر ہے تو اس میں اسکا کوئی کمال نہیں۔ غریب ہے تو اسکا کوئی قصور نہیں۔ امیر پر گھمنڈ حرام اور شکر گزاری فرض ہونے کے ساتھ ساتھ خدا کی رضا کیلئے غریب کی مدد بھی واجب ہے۔

یہ نظریہ بلند تر اجتماعی انسانی آئیڈیلز سے اس قدر تہی ہے کہ ہے کہ اسے درست تسلیم کرتے ہوئے مذہب سے ہٹ کر خالص انسانی بنیادوں پر بھی امیروں کو اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگیوں کیلئے قائل نہیں کیا جا سکتا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اگر میں امیر ہوں تو میرا کمال ہے اس میں کسی کا کیا حصہ؟ اور ''اجتماعی ذمہ داری'' کا کیا سوال؟ اسی سوچ کا ظہور امیروں کی جانب سے ٹیکسوں کے خلاف مزاحمت کی شکل میں ہوا ہے۔ اسی بات کو Brian Miller اور Mike Lapham اپنی کتاب The Self-Made Myth: And How Government Helps Individuals and Businesses Succeed میں یوں واضح کرتے ہیں:

> If one truly believes that wealth derives entirely from the efforts of self-made men, who work harder and take more risks than the rest of us, then extreme inequalities of income and wealth are morally justified as the rewards for that differing work effort. Government should do nothing to intervene. If the successful individuals at the top of our economy are solely responsible for their own fortunes, then they owe nothing back to society, and any effort to tax concentrated wealth and income is akin to "punishing success". The fact that we face the highest levels of

inequality the nation has seen since 1928 is irrelevant, or perhaps even something to be celebrated, for those who accept this frame.

اگر واقعی اس بات پر یقین رکھا جائے کہ دولت دوسروں سے زیادہ محنت کرنے اور خطرات مول لینے والوں لوگوں کی صرف اور صرف اپنی محنت کا ثمر ہے تو پھر آمدنی کی شدید ناہمواریاں اخلاقی طور پر جائز بن جاتی ہیں کیونکہ وہ تو محنت میں فرق کے نتیجے طور پر پیدا ہوتی ہیں جن کو ختم کرنے کیلئے حکومت کو کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر امیر لوگوں کی دولت محض انکی اپنی ہی محنت کا کمال ہے تو پھر ان پر معاشرے کا کوئی قرض بھی نہیں ہے جسے وہ معاشرے کو لوٹائیں۔ اس لحاظ سے جمع شدہ دولت پر ٹیکس لگانے کی کوشش بھی "جرمِ کامیابی کی سزا" بن جائے گی۔ اسی طرح اس تصور پر یقین رکھنے والے لوگوں کے نزدیک یہ حقیقت کہ آج امریکہ میں معاشی ناہمواری 1928 کے بعد کی بلند ترین سطح پر ہے بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو قابلِ جشن ہے۔

ایک امریکی سینیٹر کا جواب

ٹیکسوں کے خلاف مزاحمت کے جواب میں سینیٹر Elizabeth Warren نے اپنی ایک تقریر میں بڑی خوبصورتی سے "اپنی قسمت کے معمار" ہونے کے نظریے کی غلطی یوں واضح کی:

There is nobody in this country who got rich on his own — nobody. You built a factory out there? Good for you. But I want to be clear. You moved your goods to market on the roads the rest of us paid for. You hired workers the rest of us paid to educate. You were safe in your factory because of police-forces and fire-forces that the rest of us paid for. You didn't have to worry that marauding bands would come and seize everything at

your factory — and hire someone to protect against this — because of the work the rest of us did. Now look, you built a factory and it turned into something terrific, or a great idea. God bless — keep a big hunk of it. But part of the underlying social contract is, you take a hunk of that and pay forward for the next kid who comes along.

اس ملک میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے بل بوتے پر امیر ہوا ہو۔ کوئی ایک بھی نہیں۔ آپ نے ایک فیکٹری بنائی ہے؟ بہت اچھے۔ لیکن سنیے۔ آپ اپنی مصنوعات کو ان سڑکوں کے ذریعے منڈی تک لے جاتے ہیں جو ہمارے دیے ہوئے پیسوں (ٹیکسوں) سے بنی ہیں۔ آپکی فیکٹری میں وہ لوگ کام کرتے ہیں جنہوں نے ہمارے دیے ہوئے پیسوں کی وجہ سے تعلیم پائی۔ آپ اپنی فیکٹری میں اس پولیس اور فائر فورس کی وجہ سے محفوظ ہیں جو ہمارے دیے ہوئے پیسوں کی وجہ سے قائم ہیں۔ آپ کو غارت گر گروہوں کے خیال نہیں ستایا نہ ہی ان سے حفاظت کیلئے آپ کو لوگ رکھنے پڑے کیوں کہ آپکی حفاظت کا بندوبست ہمارے پیسے نے کیا۔ دیکھیے آپ نے ایک فیکٹری بنائی اور وہ بہت کامیاب ہوگئی۔۔۔خدا سلامت رکھے۔ اس کا بڑا حصہ آپ کو ہی مبارک ہو۔ لیکن عمرانی معاہدے کی ایک شق یہ ہے کہ اس کا بڑا حصہ تو آپ ہی رکھیں گے لیکن کچھ آپ ضرور ساتھ والوں کو دیں گے۔

باراک اوبامہ کی دلیل

بعدازاں امریکی صدر باراک اوبامہ نے اپنی ایک تقریر کے دوران اپنی قسمت کے خود مالک ہونے کے نظریے کے سرتاسر غلط ہونے کو مزید خوبصورتی سے واضح کرتے ہوئے کہا:

[L]ook, if you've been successful, you didn't get there on your own. You didn't get there on your own. I'm always

struck by people who think, well, it must be because I was just so smart. There are a lot of smart people out there. It must be because I worked harder than everybody else. Let me tell you something – there are a whole bunch of hardworking people out there.

If you were successful, somebody along the line gave you some help. There was a great teacher somewhere in your life. Somebody helped to create this unbelievable American system that we have that allowed you to thrive. Somebody invested in roads and bridges. If you've got a business – you didn't build that. Somebody else made that happen. The Internet didn't get invented on its own. Government research created the Internet so that all the companies could make money off the Internet.

دیکھیے، اگر آپ کامیاب ہوئے ہیں تو یہ صرف آپکا کمال نہیں تھا، آپ صرف اپنے بل بوتے پر یہاں نہیں پہنچے۔ میں ہمشہ ان لوگوں پر شدید حیران ہوتا ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس وجہ سے کامیاب ہیں کہ وہ بہت ذہین ہیں، لیکن جناب ذہین تو اور بھی بہت ہیں۔ یا پھر یہ کہ انہوں نے محنت بہت کی ہے لیکن محنت تو اور بھی بہت لوگ کر رہے ہیں۔

بات یہ ہے کہ اگر آپ کامیاب ہیں تو دوسروں کی مدد سے۔ شاید کسی عظیم استاد کی وجہ سے، دوسروں کے تخلیق کیے ہوئے اس عظیم امریکی نظام کی وجہ سے جو آپ کو ترقی کی اجازت دیتا ہے۔ اسی طرح سڑکوں اور پلوں پر دوسروں کا پیسہ لگا ہے۔ اگر آپکا کوئی کاروبار ہے تو یاد رکھیے اسے آپ نے نہیں بلکہ دوسروں نے آپ کیلئے تخلیق کیا ہے۔ انٹرنیٹ بھی از خود تخلیق نہیں ہوا۔ اسے حکومت نے پیسے دے کر ریسرچ کے ذریعے تخلیق کروایا ہے تاکہ سب کمپنیاں اس سے پیسہ کما سکیں۔

اوبامہ کے یہ الفاظ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں کیونکہ ان سے انسان کے اپنی قسمت کے معمار ہونے کے خرافاتی نظریے کی لغویت بالکل واضح ہو جانے کے ساتھ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کی کامیابی دراصل افراد سے لے کر کسی ملک اور خطے کے سیاسی اور سماجی نظام تک بے شمار عوامل کا پراڈکٹ یا نتیجہ ہوتی ہے۔

بل گیٹس کے والد کی گواہی

تاہم اس موضوع پر حرفِ آخر موٹیویشنل سپیکرز کے Ultimate Living Ideal بل گیٹس کے والد گیٹس سینئر کی گواہی ہے جو انہوں نے Brain Miller اور Mike Lapham کی محولہ بالا کتاب پر تقریظ لکھتے ہوئے دی ہے۔ پڑھیے:

As an attorney for almost 50 years, I worked closely with entrepreneurs and saw how their business enterprises are boosted by government efforts to create a stable and positive business environment. I also had a front-row seat for the creation and the growth of my son's business (Microsoft), and I observed the many ways our country's publicly supported infrastructure, tax laws, government funded research, education, patent protection, and so forth helped the company grow. As I've said numerous times, I have no doubt that growing the company in the fertile soil of the United States accounts for a significant portion of the value of that enterprise; and if you had plunked Bill down in some developing country, even with all of his intelligence, creativity, and hard work, the company would probably have gone nowhere. Being born in this country is the

ingredient that most reliably determines whether a person has the opportunity to become wealthy.

بطور ایک وکیل میں نے قریب پچاس سال کاروباری لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے اور بہت قریب سے دیکھا ہے کہ کس طرح ان کے کاروبار کو کاروبار کیلئے سازگار ماحول پیدا کرنے کی حکومتی کوششوں سے فائدہ پہنچتا ہے۔ میں اپنے بیٹے کے کاروبار (مائیکرو سوفٹ) کی تخلیق اور نمو کے دوران بھی پیش پیش رہا ہوں اور یہاں بھی میں نے یہی دیکھا ہے کہ ہمارے ملک میں حکومتی خرچے پر تخلیق کیے گئے بنیادی ڈھانچے، ٹیکس قوانین، حکومتی مدد سے کی جانے والی ریسرچ، تعلیم، پیٹنٹ کے تحفظ اور اسی طرح کی کئی چیزوں نے اسکی کمپنی کو ترقی کرنے میں بہت مدد دی ہے۔ جیسا کہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ مجھے اس بات میں ذرا سا بھی شبہہ نہیں کہ اس کمپنی کا امریکہ کے زرخیز ماحول میں شروع ہونا ہی اسکی کامیابی کی بہت بڑی وجہ ہے۔ اس کے بجائے بل (گیٹس) اگر کسی ترقی پذیر ملک میں ہوتا تو باوجود اسکی ساری ذہانت، تخلیقی صلاحیت اور محنت کے آج یہ کمپنی شاید کچھ بھی نہ ہوتی۔ اس ملک میں پیدا ہونا ہی وہ چیز ہے جو طے کرتی ہے کہ آپ کو دولت مند بننے کا موقع ملے گا بھی یا نہیں۔

کیا کامیابی میں حالات کا کوئی کردار نہیں؟ دوسرا امتمول ترین امریکی کیا کہتا ہے؟

جیسا کہ اب تک قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ انسان کے اپنی کامیابی کا خود ہی واحد ذمہ دار ہونے کا خرافاتی تصور خالصتاً امریکی ہے۔ جو کہ وہاں ایک خاص تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں پیدا ہوا اور جسے امریکہ میں نچلی سطح سے اٹھ کر دولت مندی کے مقام پر پہنچ جانے والے کئی افراد کی مثالوں سے تقویت ملی۔ اگرچہ، جیسا کہ اوپر کی بحث سے واضح ہوا، اس میں افراد کے کمال سے زیادہ وسائل کی فراوانی، سرمایہ داری اور بہتر نظامِ حکومت کا دخل ہے۔ تاہم حیرت تب ہوتی ہے جب ہمارے ملک کے موٹیویشنل سپیکرز اس تصور کا

پرچار کرتے ہیں۔ ایک دفعہ میری موجودگی میں ایک طالبِ علم نے ایک موٹیویشنل سپیکر سے کہا کہ جناب ہمارے ملک میں تو بدعنوانی ہے، سفارش ہے، وسائل کی کمی ہے تو انہوں نے بڑے یقین سے کہا کہ یہ سب بہانے ہیں اگر آپ میں ٹیلنٹ ہے اور آپ محنت کرتے ہیں تو ان میں سے کوئی چیز آپکا راستہ نہیں روک سکتی۔ کیا واقعی؟ اوپر میں نے بل گیٹس سینئر کے الفاظ نقل کیے ہیں جو اپنے بیٹے کے بارے میں کہتا ہے کہ اگر وہ امریکہ میں پیدا نہ ہوتا تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا۔ اب یہ بھی دیکھیے کہ دوسرا امتمول ترین امریکی Warren Buffet اس بارے میں کیا کہتا ہے:

> I personally think that society is responsible for a very significant percentage of what I've earned. If you stick me down in the middle of Bangladesh or Peru or someplace, you'll find out how much this talent is going to produce in the wrong kind of soil. I will be struggling 30 years later. I work in a market system that happens to reward what I do very well—disproportionately well.

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کمایا ہے اس میں بہت بڑا کردار ہمارے معاشرے کا ہے۔ اگر مجھے بنگلہ دیش، پیرو یا اسی طرح کی کسی جگہہ پر چھوڑ دیں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ میری ذہانت کا ناسازگار ماحول میں کیا حشر ہوتا ہے، تیس سال بعد بھی میں دھکے ہی کھا رہا ہوں گا۔ میں اتفاق سے ایک ایسی مارکیٹ میں ہوں جو میرے کام کا بہت اچھا صلہ دیتی ہے۔ حد سے زیادہ اچھا صلہ۔

قسمت کے محدود کردار کا نظریہ

اس کا ایک جواب یہ دیا جاتا ہے کہ چلیے پاکستان میں مختلف رکاوٹوں کی وجہ سے امریکہ جتنی کامیابی تو نہیں حاصل کی جا سکتی مگر جتنی بھی حاصل کی جا سکتی ہے وہ بہر حال انسان کی محنت اور ٹیلنٹ سے راست متناسب

ہے۔ یا پھر یوں کہ امریکہ میں موافق حالات نے محض کامیابی کے حدود بڑھائے ہیں اور امریکی نظام جو مواقع فراہم کرتا ہے وہ سب کیلئے یکساں ہیں اور وہ شخص زیادہ کامیاب ہوگا جو اپنے محنت، ٹیلنٹ اور بہتر منصوبہ بندی کی بنیاد پر ان سے زیادہ بہتر فائدہ اٹھالے گا اور اس میں قسمت کا کوئی دخل نہیں۔ (ضمناً یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ Success Literature میں قسمت کی طرح پیدائشی ٹیلنٹ کا کھلم کھلا انکار تو نہیں کیا جاتا لیکن محنت کے مقابلے میں اسے بہت کم درجے پر رکھا جاتا ہے اور پرچار کیا جاتا ہے کہ کوئی بھی محنت سے ٹیلنٹ حاصل کرسکتا ہے)۔ اور یہ کہ اگر ایک شخص پاکستان میں پیدا ہوا ہے تو بھی وہ زیادہ محنت سے وہ سب کچھ حاصل کرسکتا ہے جو ایک شخص امریکہ میں حاصل کرسکتا ہے۔ قسمت کا کردار بس اتنا ہے کہ پاکستان میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسے تھوڑی زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ موٹیویشنل سپیکرز جب کبھی مجبوری سے کامیابی میں قسمت کا کردار تسلیم کریں بھی تو اسے کامیابی پر اثرانداز ہونے والے عوامل کی فہرست میں آخری نمبر پر رکھتے ہیں اور اسے ایک دو فیصد سے زیادہ وزن نہیں دیتے۔ اکثر نے تو قسمت کی تعریف بھی بدل کر ایسی کردی ہے کہ اب قسمت بھی محنت اور منصوبہ بندی کا نتیجہ نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ٹریسی قسمت کے سات اہم عوامل بتاتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک سیکھا جاسکتا ہے۔ گویا کہ کچھ چیزیں سیکھ کر آپ خوش قسمت بن سکتے ہیں۔ اسی طرح اکثر یہ سپیکرز کہتے نظر آئیں گے کہ:

> The meeting of preparation with opportunity generates the offspring we call luck.

اگر تمام انسانوں کی زندگیوں کو بیک وقت سامنے رکھ کر ان میں تبدیلیوں کو دیکھا جائے تو کامیابی کی Randomness واضح طور پر نظر آنے لگتی ہے۔ جس طرح کامیابی کی مثالیں ملتی ہیں اسی طرح ناکامی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ تاہم ناکامی کی مثالوں کا عموماً ذکر نہیں کیا جاتا کیوں کہ وہ اس Illusion کو توڑ دیتی ہیں جس پر سارے کاروبارِ رجائیت کا دارومدار ہے۔

خوش قسمتی دراصل تیاری کے موقع سے ملاپ کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔

گویا اصل اہمیت تیاری کی ہے۔

قسمت کا کردار۔ مذہبی اور لامذہبی نظریے کے مطابق

کیا واقعی ایسا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اول تو اس کو ایک بلند تر تجریدی نظریاتی سطح پر بھی درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کامیابی یا ناکامی کا یہ کھیل اگر مذہبی نظریے پر یقین رکھا جائے تو خدائی اسکیم کے تحت انسان کی آزمائش کیلئے چل رہا ہے جس میں انسان کا contribution بہت کم ہے۔ اور خالص لامذہبی نظریے پر یقین رکھتے ہوئے بھی اسے درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ لامذہبی تصور تو مذہبی تصور سے بھی بڑھ کر Deterministic ہے۔ اگر خدا نہیں ہے تو پھر تو سب کچھ محض اتفاقات کا کھیل ہے۔ جو شخص صحیح وقت پر اتفاق سے صحیح جگہ موجود تھا وہ "کامیاب" ہو گیا۔ جو نہیں تھا وہ نہیں ہوا۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ اس نظریے کو مذہبی اور لامذہبی کسی بھی نقطۂ نظر کے مطابق درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم کچھ حضرات مذہب سے اس کیلئے دلائل فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان لیس للانسان الا ماسعی سے استدلال کرتے ہیں۔ درآنحالیکہ اس آیت کا سیاق و سباق چیخ چیخ کر بتا رہا ہے کہ یہ اخروی معاملات کے متعلق ہے۔ اللہ نے انسان کو صرف اخلاقی معاملات میں اختیار دیا ہے اور اس میں بھی اس کی جوابدہی نتیجے کی بنیاد پر نہیں بلکہ کوشش کی بنیاد پر ہوگی۔ یہ دنیا جائے امتحان ہے یہاں کسی کو کتنی "کامیابی" ملتی ہے وہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ کوشش کا مکلف اللہ نے انسان کو کیا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھی جانی چاہیے کہ کوشش کا نتیجہ انسان کے نہیں اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

حالات اور کامیابی۔۔۔ تحقیق کے نتائج

دوم یہ کہ تجریدیت کی کم تر سطح پر بھی متعدد اثباتی طریقوں سے بھی قسمت کا کردار واضح کیا جا سکتا ہے۔ مثال

کے طور پر یہ بات بار بار کی سٹڈیز (حوالہ جات آخر میں ملاحظہ ہوں) کے بعد اب طے شدہ تسلیم کی جاتی ہے کہ بچپن میں انسان کی صحت اور اسے ملنے والی خوراک کی غذائیت کا بعد کی زندگی میں اس کی صحت اور تعلیمی ومعاشی نتائج کے ساتھ واضح تعلق ہے۔ ان میں سے بعض تحقیقات میں کئی عشروں کا ڈیٹا استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایسی بھی متعدد سٹڈیز بھی موجود ہیں جن میں بچے کی صحت پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ والدین (خصوصاً ماں) کی تعلیم، آمدنی اور رہائش بچے کی صحت پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ گویا اب مکمل تصویر اس طرح سے بنتی ہے کہ بچے کے والدین کی تعلیم، آمدنی اور رہائش طے کرے گی کی بچپن میں اسے کیسی غذا ملے گی اور اسکی صحت کیسی ہوگی۔ پھر یہ چیز طے کرے گی کہ بڑا ہو کر بچے کی صحت کیسی ہوگی، اسے کون کون سی بیماریاں لاحق ہوں گی اور وہ کتنی تعلیمی اور معاشی کامیابی حاصل کرے گا۔

دوسرے الفاظ میں موٹیویشنل سپیکرز کے دعووں کے برعکس ریسرچ بالکل واضح طور پر انسان کی کامیابیوں میں حالات کے کردار کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ کئی عشروں کے ڈیٹا پر مشتمل ایک دلچسپ تحقیق میں تو یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ بچپن میں ملنے والے موسم کا بھی خواتین کی خوشحالی سے براہ راست تعلق ہے!

کامیابی قسمت کا کھیل ہے-ایک تحقیق

اب اس پر ایک اور زاویے سے بھی نظر ڈالتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ ایک ہی کام کریں تو کیا ملنے والی کامیابی کا انحصار کیا انکی محنت، ٹیلنٹ اور لگن پر ہے یا یہ محض قسمت کا کھیل ہے؟ یہاں بھی ریسرچ، موٹیویشنل سپیکرز کے دعووں کی تردید کرتی ہے کیوں کہ اسکے نتائج سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض قسمت کا کھیل ہے

Salganik اور Watt نے اپنی تحقیق کے دوران ایک ویب سائٹ بنائی اور اس پر کچھ نئے گلوکاروں کے گانے اپ لوڈ کیے۔ جب کوئی اس ویب سائٹ کو وزٹ کرتا تو اسے سائٹ کے کئی حصوں میں سے کسی ایک حصے میں بھیج دیا جاتا۔ ہر حصے میں وہی گانے رکھے گئے جو باقی سب حصوں میں رکھے گئے لیکن ایک حصے

میں جانے والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دوسرے حصوں میں کیا ہو رہا ہے۔ اپنے حصے میں لوگوں سے کہا گیا کہ وہ گانوں کو Rate کریں۔ مقصد یہ تھا کہ دیکھا جائے کہ ایک حصے میں لوگوں نے جو گانے پسند کیے کیا وہ گانے دوسرے حصوں میں بھی اتنے ہی پسند کیے گئے؟ اگر ایسا ہوتا تو کہا جاتا کہ کوئی گانا کتنا پسند کیا جاتا ہے اس کا انحصار اس کی کوالٹی پر ہے۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ اگرچہ تمام حصوں میں کم و بیش ایک جیسی عمریں، تعلیم اور بیک گراؤنڈ رکھنے والے لوگوں نے گانے سنے لیکن ہر حصے میں الگ الگ گانے پسند کیے گئے۔ گویا کہ گانے کی کامیابی کا تعلق اسکی کوالٹی سے نہیں بلکہ یہ بالکل Random ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ قسمت کا کھیل ہے۔

ایک اور دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ جس گانے کو شروع میں لوگوں نے پسند کر لیا آگے آنے والوں کی طرف سے اس کے پسند کیے جانے کے امکانات بڑھ گئے۔ گویا کامیابی کا انحصار خوش قسمتی پر ہے۔

میتھیو ایفیکٹ Methew Effect

محض اتفاق یا خوش قسمتی سے پہلے شخص کی طرف سے گانا پسند کر لیے جانے کی اہمیت صرف اتنی نہیں کہ اسے ایک ووٹ مل گیا بلکہ یہ دوسروں کے مقابلے میں ایک ایسی اتفاقی برتری ہے جو مستقبل میں مزید تیز رفتاری سے بڑھتی چلی جائے گی۔ آسانی کیلئے یوں سمجھیں کہ ویب سائٹ پر صرف پانچ گانے ہیں۔ پہلے ووٹر نے الف گانے کو پسند کر لیا۔ اس کے بعد فرض کر لیں دو ووٹرز اکھٹے ویب سائٹ پر آ گئے۔ وہ دیکھیں گے کہ الف گانے کو ایک ووٹ مل چکا ہے تو ان کے اس ہی گانے کو ووٹ دینے کے امکانات بڑھ جائیں گے (انسانوں میں بھیڑ چال کا رویہ ایک معلوم حقیقت ہے)۔ اب فرض کریں کہ ان دو میں سے ایک الف کو ووٹ دیتا ہے اور ایک جیم کو۔ اب آئندہ آنے والے ووٹر کو نظر آئے گا کہ الف کو دو لوگوں نے پسند کیا ہے تو ان کے الف کو ہی ووٹ دینے کے امکانات مزید بڑھ جائیں گے۔ فرض کریں کے بیس ووٹ پڑنے کے بعد الف کو بارہ ووٹ مل چکے ہیں اور باقیوں کو ایک، دو یا چار ووٹ پڑے ہیں۔ اس کے بعد والے ووٹر جب دیکھیں گے کہ

الف کو باقیوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ووٹ پڑے ہیں تو ان کے بھی اسی کو ووٹ دینے کے امکانات اور بڑھ جائیں گے۔ اس طرح سے ہر نیا ووٹ نہ صرف الف گانے کی برتری بلکہ اس کو مزید ووٹ ملنے کے امکان کو بھی بڑھا رہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جوں جوں الف گانے کو ووٹ ملنے کا امکان بڑھ رہا ہے توں توں دیگر کو ووٹ ملنے کا امکان کم بھی ہو رہا ہے۔ اسے میتھیو ایفیکٹ کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ انجیلِ متیٰ کا یہ جملہ ہے:

> For unto every one that hath shall be given, and he shall have abundance: but from him that hath not shall be taken even that which he hath. — Matthew 25:29
>
> ترجمہ: جس کے پاس ہے اسے اور دیا جائے گا اور وہ خوشحال ہوگا۔ لیکن جس کے پاس نہیں ہے اس سے وہ بھی چھین لیا جائے گا جو اس کے پاس ہے۔

اب اگر الف گانے والا گلوکار یہ سمجھنا شروع کر دے کہ اسے یہ کامیابی اپنی محنت اور لیاقت سے ملی ہے تو یہ حماقت ہی کہلائے گی۔ اس کی ساری کامیابی (اور دیگر کی ناکامی) کا بڑا انحصار اس پہلے ووٹ پر تھا جو محض اتفاقات کے نتیجے میں اسے ملا۔ اگر پہلا ووٹر کسی اور سٹیٹ آف مائنڈ میں ہوتا، یا اس کی جگہہ کوئی اور ووٹر آ جاتا جسے اپنے موڈ یا افتادِ طبع کے لحاظ سے گانا "ب" پسند آ جاتا تو اس وقت "ب" گانا سب سے زیادہ مقبول ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے ووٹر نے بے دھیانی میں بنا سنے ہی اس گانے کو ووٹ دے دیا ہو۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اسکی مثال سے بھی اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب اس وجہ سے ممکن ہوئی کہ شاہد اعوان صاحب (اس کتاب کے پبلشر) کی نظر میری ایک فیس بک پوسٹ پر پڑ گئی اور انہوں نے اصرار کیا کہ میں اپنے خیالات کو کتابی صورت میں مرتب کروں۔ میری ان سے یہ سطور سپردِ قلم کرنے تک بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی نہ ہماری کوئی ذاتی شناسائی ہے۔ انکی نظر میری پوسٹ پر اس لیے پڑی کہ وہ فیس بک پر میری فرینڈز لسٹ میں تھے۔ وہ میری فرینڈز لسٹ میں اس لیے تھے کہ انہوں نے کسی مشترکہ

دوست کی پوسٹ پر میرا کوئی تبصرہ پڑھا تو مجھے فرینڈ ریکویسٹ بھیج دی۔ فرض کریں کہ اس دن شاہد صاحب کسی مصروفیت کی وجہ سے فیس بک پر نہ آپاتے۔ نہ انکی نظر مشترکہ دوست کی پوسٹ پر میرے تبصرے پر پڑتی نہ ہم دوست بنتے نہ ہی انکو میرے خیالات سے آگاہی ہوتی، نہ یہ کتاب کبھی لکھی جاتی اور نہ ہی شائع ہوتی۔

اب اس پر مزید غور کریں کہ ایک کتاب شائع ہونے کے بعد میرے لیے دوسری کتاب شائع کروانا کئی گنا آسان ہوگیا ہے۔ اب کیا مجھے اپنے آپ کو بہت ذہین، محنتی اور عظیم مصنف سمجھنا اور یہ دعوے کرنا شروع کر دینا چاہیے کہ کوئی بھی اگر چاہے تو مصنف بن سکتا ہے اور اگر نہیں بن پا رہا تو اس کا اپنا قصور ہے؟ درآنحالیکہ مجھے پہلی کامیابی ایک بہت چھوٹے سے ایسے اتفاق کے نتیجے میں ملی جس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا اور اس نے میرے لیے مزید کامیابیاں حاصل کرنا آسان بنا دیا جبکہ مجھ سے کئی گنا بہتر آئیڈیاز اور صلاحیت رکھنے والے بے شمار لوگ شدید محنت کے باوجود کبھی اپنی کتاب شائع نہیں کروا سکیں گے۔ نہ وہ برے لکھاری ہیں نہ میں اچھا۔ یہ محض قسمت کا کھیل ہے۔

درحقیقت کامیابی اور ناکامی کا سارا کھیل اتفاقات کا کھیل ہے۔ بالکل ایسے جیسے کہ کاغذوں سے بھرے ایک کمرے میں آپ پنکھا چلا دیں تو کاغذ اڑنا شروع کر دیں گے۔ ان میں سے کچھ Randomly اوپر جائیں گے اور کچھ نیچے نیچے اڑیں گے۔ کچھ اوپر جا کر دوبارہ نیچے آئیں گے۔ پنکھا جتنا زور سے چلے گا کاغذ اسی قدر تیزی سے حرکت کریں گے۔

انسان کے بس سے باہر ہونے واقعات کا کامیابی اور ناکامی پر اثر

اگر تمام انسانوں کی زندگیوں کو بیک وقت سامنے رکھ کر ان میں تبدیلیوں کو دیکھا جائے تو کامیابی کی Randomness بالکل واضح طور پر نظر آنے لگتی ہے۔ جس طرح کامیابی کی مثالیں ملتی ہیں اسی طرح ناکامی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ تاہم عموماً ناکامی کی مثالوں کا ذکر نہیں کیا جاتا کیوں کہ وہ اس Illusion کو توڑ دیتی ہیں جس پر سارے کاروبارِ حیات کا دارومدار ہے۔ مثلاً ایک کہانی پڑھیے: "وہ ایک معمولی پولیس

والے کی بیٹی تھی لیکن اس کے اندر کچھ کر گزرنے کی شدید خواہش اور انتھک محنت کا جذبہ تھا۔ انہی دو چیزوں کے بل بوتے پر اس نے جو چاہا حاصل کیا۔ 13 سال کی عمر میں وہ نیویارک کی سب سے مشہور ایتھلیٹ تھی۔ لیکن اسے اس سے بہت آگے جانا تھا۔ اس نے مزید محنت کی اور دنیا کی صف اول کی یونیورسٹیوں میں سے ایک، ہارورڈ میں داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ یونیورسٹی میں سے اس نے اعزاز کے ساتھ قانون کی ڈگری حاصل کی اور اسے نیویارک کی مشہور ترین لاء فرم نے ملازمت کی پیشکش کردی جسے قبول کرتے ہوئے اس نے اس فرم کو جوائن کرلیا۔ اس نے بہت جلد اپنی محنت سے وکالت میں بھی اپنا نام بنالیا اور اسکا شمار صف اول کے وکلاء میں ہونے لگا۔ اس کے باوجود اسے اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی اصل دلچسپی فنانس کے سبجیکٹ میں ہے۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ یا تو اپنی موجودہ شاندار ملازمت کو جاری رکھتی اور اپنے Passion کو چھوڑ دیتی۔ یا پھر وہ سب کچھ ٹھکرا دیتی اور اپنے Passion کو فالو کرتی۔ اس نے اس دوسرے راستے کا انتخاب کیا اور وکالت کو خیر باد کہہ کر ایک بینک میں چھوٹی سی ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں اس کی قابلیت بہت کھل کر سامنے آئی اور وہ بہت جلد ترقی کے زینے طے کرنے لگی۔ اس نے اپنی قابلیت کا لوہا کچھ اس طرح سے منوایا کہ صرف چند ہی سالوں بعد امریکہ کے سب سے معتبر فنانشل ادارے نے اسے بطور چیف فنانشل آفیسر ہائر کرلیا۔ وہ اسکی کمپنی کی ایک 158 سالہ تاریخ میں اتنے بڑے عہدے پر پہنچنے والی پہلی خاتون بن گئی اور اس وقت اس کی عمر صرف 41 برس تھی۔" یہ سچی کہانی ہے لیکن آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کیونکہ صرف چند ہی مہینوں بعد یہ معتبر ترین ادارہ Lehman Brothers دیوالیہ ہوگیا اور اسکے ساتھ ہی یہ خاتون Erin Callan بھی برباد ہوگئی۔ اب وہ کہیں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

اس کہانی میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس واقعے نے Erin Callan کو برباد کیا وہ بڑی حد تک اس کے اختیار سے باہر تھا۔ تو کیا پھر یہ بھی درست نہیں ہے کہ اس کے یہاں تک پہنچنے میں بھی زیادہ تر ایسے ہی واقعات کا دخل تھا؟

کامیابی ہو یا ناکامی، وہ اہم ترین واقعات جو کسی فرد کی زندگی میں سب سے زیادہ اچھا یا برا اثر چھوڑتے ہیں وہ حادثاتی اور انسان کے بس سے باہر ہوتے ہیں۔ نسیم طالیب لکھتا ہے:

Look into your own existence. Count the significant events, the technological changes, and the inventions that have taken place in our environment since you were born and compare them to what was expected before their advent. How many of them came on schedule? Look into your own personal life, to your choice of profession say, or meeting your mate, your exile from your country of origin, the betrayals you faced, your sudden enrichment or impoverishment. How often did these things occur according to plan?

آپ اپنی ہی ذات کو دیکھ لیں۔ اپنے پیدائش سے لے کر اب تک کے اہم واقعات کو دیکھیں، ٹیکنالوجی اور ماحول میں رونما ہونے والی دوسری تبدیلیوں کو دیکھیں۔ ان میں سے کتنی ایسی ہیں جو توقع کے مطابق ہوئیں؟ اپنی زندگی کو دیکھیں مثلاً آپ کا اپنے پیشے کا انتخاب، اپنے شریکِ حیات سے آپکی ملاقات، ترکِ وطن، آپ کو ہونے والے دھوکے، اچانک خوشحالی یا بدحالی۔۔ آخر ان میں کتنی چیزیں ایسی ہیں جو عین آپکی منصوبہ بندی کے مطابق ہوئیں؟۔

کیرئیر، قسمت اور اتفاق

مینجمنٹ سائنس کے کچھ سکالرز نے کچھ عرصہ قبل اس حقیقت کو پا لیا تھا۔ مثال کے طور پر Marry Guindon اور Fred Hanna نے 2002 میں اپنے آرٹیکل میں لکھا:

One tenet that shaped the direction of career counseling is the view that career development is linear,

progressive, and rational….. The trait-factor approach developed in a deterministic system that assumed all factors were measurable and know-able. However, many counselors are aware that unknowable instances of coincidence, happenstance, and chance factors can play a significant role in career opportunities…..We propose that these factors point to the nonlinear and a causal phenomenon of synchronicity.

کیریئر کونسلنگ کی سمت متعین کرنے والا ایک بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ کیریئر ایک سیدھا سیدھا، رفتہ رفتہ بلندی کی طرف جانے والا اور منطقی راستے پر چلنے والا کوئی عمل ہے۔۔۔ یہ وہ خاصیتی نظریہ ہے جو ایک ایسی قطعیت پسندانہ سوچ کے تحت ظہور میں آیا ہے جسکی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ تمام عوامل جانے جا سکتے ہیں اور ان کی مقدار ٹھیک ٹھیک متعین کی جا سکتی ہے۔ تاہم بہت سے کونسلرز اس چیز سے واقف ہیں کہ بہت سے اتفاقی عوامل جن کو ٹھیک سے نہیں جانا جا سکتا، کیریئر کے مواقع پر بہت طاقتور طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔۔۔ ہم یہ تصور پیش کر رہے ہیں کہ یہ عوامل ہم زمانیت کے غیر ہموار اور غیر سببی مظہر کی موجودگی کا پتا دیتے ہیں۔

انہوں نے مختلف کیس سٹڈیز کی مدد سے واضح کیا کہ کس طرح اتفاقیہ واقعات کیریئر میں اہم ثابت ہوتے ہیں۔ انہی بنیادوں پر بعد میں Chaos Theory of Careers وجود میں آئی جس میں کیریئر پر اثر انداز ہونے والے بیرونی اثرات کا وجود تسلیم کرتے ہوئے اسے کیریئر پلاننگ کے لیے ضروری تسلیم کیا گیا ہے۔

Robert Pryor اور Jim Bright نے اپنے 2014 کے آرٹیکل میں بہت ساری ایسی سٹڈیز کا حوالہ دیا ہے جو کیریئر میں Chance اور Luck کے اثرات کا Empirical ثبوت دیتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان سٹڈیز میں چانس کا اثر 69 فیصد سے 85 فیصد تک معلوم ہوا ہے۔

John Crumboltz اپنی Happenstance Learning Theory پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

Over the course of my lifetime so far, I personally have been employed as a gardener, magazine sales person, chauffeur, farmer, drill press operator, aluminum foundry worker, cereal packager, railroad loader, elevator operator, chemist's assistant, pancake taster, book publisher's assistant, radio announcer, teaching assistant, tennis coach, camp counselor, career counselor, high school counselor, algebra teacher, military officer, test construction specialist, research psychologist, professor, and author. I did not, and never could have, predicted this pattern of employment. And who knows what I will do next?

I have frequently been invited to speak with groups of career counselors, probably several thousands of them now. I almost always begin by saying something like this: "You are now employed as a career counselor. Had you decided to become a career counselor when you were 18 years old?" So far the number of career counselors answering yes is zero.

انسان کے اپنی قسمت کا مالک ہونے کا نظریہ Over-simplistic اور بالکل مضحکہ خیز ہے جس کے لیے کوئی علمی دلیل موجود نہیں ہے جبکہ اس پر یقین رکھنے کے اخلاقی اور سماجی نتائج سنگین ہوسکتے ہیں۔

اپنی زندگی میں اب تک میں بطور مالی، میگزین بیچنے والا، ڈرائیور، کسان، ڈرل پریس آپریٹر، المونیم بھٹی مزدور، غلہ پیک کرنے والا، قلی، لفٹ چلانے والا، داروساز کا مددگار، کلوچ چیک کرنے والا، ناشر کا مددگار، ریڈیو اناؤنسر، ٹیچنگ اسسٹنٹ، ٹینس کوچ، کیمپ کونسلر، کیریئر کونسلر، ہائی سکول کونسلر، الجبرا کا استاد، فوجی افسر، ماہر ٹیسٹ ساز، تحقیقی نفسیات دان، پروفیسر اور مصنف کام کر چکا ہوں۔ میں کبھی بھی اس طرح کے کیریئر کی پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اور کیا پتا میں آگے کیا کروں گا۔

مجھے کئی بار کیریئر کونسلرز سے بات کرنے بلایا گیا ہے اور میں ہر بار اس سوال سے آغاز کرتا ہوں کہ آج تو آپ کیریئر کونسلر ہیں مگر کیا آپ نے اٹھارہ سال کی عمر میں فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ یہ بنیں گے؟ اب تک اس سوال کا جواب ہاں میں دینے والوں کی تعداد صفر ہے۔

اس ساری بحث کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ دنیا بہت پیچیدہ جگہ کا نام ہے۔ یہاں لاتعداد فیکٹرز کارفرما ہیں جو لاتعداد Combinations میں فرد پر Randomly اثر انداز ہوتے اور یہ طے کرتے ہیں کہ کس کے ساتھ کیا ہونا ہے۔ انسان کی اپنی پلاننگ، صلاحیت اور محنت ان لاتعداد میں فیکٹرز میں سے صرف تین ہیں۔ یہ خیال بہت مضحکہ خیز ہے کہ صرف یہی تین فیکٹرز طے کرتے ہیں کہ انسان کے ساتھ کیا ہونا ہے۔

بیانیے کا مغالطہ- کامیابی کی کہانیاں ناقابلِ اعتبار ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ Daniel Kahneman کی کتاب میں سے ایک نسبتاً طویل اقتباس نقل کیا جائے جس میں اس نے اسی بات کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ان سادہ کہانیوں پر یقین کر لینے کی وجوہات کو بھی بیان کیا ہے۔ پہلے وہ نسیم طالیب کے حوالے سے لکھتا ہے:

The trader -philosopher- statistician Nassim Taleb could also be considered a psychologist. In The Black Swan, Taleb introduced the notion of a narrative fallacy to

describe how flawed stones of the past shape our views of the world and our expectations for the future. Narrative fallacies arise inevitably from our continuous attempt to make sense of the world. The explanatory stories that people find compelling are simple; are concrete rather than abstract; assign a larger role to talent, stupidity, and intentions than to luck; and focus on a few striking events that happened rather than on the countless events that failed to happen. Any recent salient event is a candidate to become the kernel of a causal narrative. Taleb suggests that we humans constantly fool ourselves by constructing flimsy accounts of the past and believing they are true.

تاجر، فلسفی اور شماریات دان نسیم طالیب ایک لحاظ سے نفسیات دان بھی ہے۔ اس نے اپنی کتاب "دی بلیک سوان" میں "بیانیے کا مغالطہ" کی اصطلاح یہ دکھانے کیلئے وضع کی ہے کہ کیسے دنیا کے متعلق ہمارے تصور اور مستقبل کے متعلق ہماری توقعات کی تعمیر ماضی کے ناقص پتھروں سے ہوتی ہے۔ بیانیوں کے مغالطے دراصل ہماری دنیا کو سمجھنے کی مسلسل کوشش سے پیدا ہوتے ہیں۔ ماضی کے متعلق لوگوں کو ناقابلِ تردید معلوم ہونے والی وضاحتی کہانیاں پیچیدہ کے بجائے سادہ اور تجریدی کے بجائے بہت معین ہوتی ہیں۔ ان میں ذہانت، حماقت اور نیت کا کردار قسمت کے مقابلے میں بہت بڑا معلوم ہوتا ہے اور ان میں بے شمار نہ ہو پانے والے واقعات کے بجائے صرف ان واقعات کا ذکر ہوتا ہے جو رونما ہو گئے۔ آج کا کوئی بھی نمایاں واقعہ کل کو کسی ایسی ہی کہانی کا سبب بن سکتا ہے۔ نسیم طالیب کہتا ہے کہ ہم انسان ماضی کے متعلق ایسی ہی ردی کہانیاں تخلیق کر کر کے خود کو مسلسل دھوکہ دیے رکھتے ہیں۔

پھر وہ گوگل کی کہانی کی مثال دیتا ہے کہ وہ ایسی ہی ایک کہانی ہے۔ دو سٹوڈنٹس معلومات ڈھونڈنے کا ایک بہتر طریقہ سوچتے ہیں، فنڈز اکٹھے کرتے ہیں، کمپنی شروع کرتے ہیں اور چند ہی سالوں میں یہ کمپنی کامیاب ترین کمپنیوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ صرف ایک موقع پر وہ خوش قسمت ثابت ہوتے ہیں جب انہوں نے کمپنی بیچنے کی کوشش کی لیکن خریدار کے خیال میں وہ زیادہ قیمت مانگ رہے تھے۔

تاہم Kahenman کہتا ہے کہ یہ کہانی بہت ادھوری ہے جس میں صرف گوگل کے بانیوں کا ذکر ہے لیکن ان لاتعداد واقعات کا کوئی ذکر نہیں جو ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہو رہے تھے۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے:

> I intentionally told this tale blandly, but you get the idea: there is a very good story here. Fleshed out in more detail, the story could give you the sense that you understand what made Google succeed; it would also make you feel that you have learned a valuable general lesson about what makes businesses succeed. Unfortunately, there is good reason to believe that your sense of understanding and learning from the Google story is largely illusory. The ultimate test of an explanation is whether it would have made the event predictable in advance. No story of Google's unlikely success will meet that test, because no story can include the myriad of events that would have caused a different outcome. The human mind does not deal well with nonevents. The fact that many of the important events that did occur involve choices further tempts you to exaggerate the role of skill and underestimate the part that luck played in the outcome. Because every critical decision turned out well, the record suggests almost flawless prescience—but bad luck could have disrupted

any one of the successful steps.

میں نے جان بوجھ کر یہ کہانی گول مول سی بیان کی ہے لیکن آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ بہت اچھی کہانی ہے۔ اگر یہ کہانی زیادہ تفصیل سے سنائی جائے تو ممکنہ طور پر آپ کو یہ محسوس ہونا شروع ہو جائے گا کہ آپ نے گوگل کی کامیابی کی وجوہات ٹھیک سمجھ لی ہیں۔ برآں مزید آپ کو یہ بھی لگنا شروع ہو جائے گا کہ آپ نے کاروبار کی کامیابی کا ایک عمومی سبق سمجھ لیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایسا سمجھنے کی ایک بہت اچھی وجہ موجود ہے کہ آپ کا گوگل کی کہانی سن کر سمجھ جانے اور جان لینے کا احساس بڑی حد تک محض ایک وہم ہے۔ کسی بھی وضاحت کی صحت کا حتمی امتحان یہ ہے کہ کیا اسکی بنیاد پر پہلے سے ہی درست پیشگوئی کی جاسکتی تھی؟ گوگل کی غیر متوقع کامیابی کی کوئی بھی وضاحتی کہانی اس امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکتی کیونکہ کسی بھی کہانی میں وہ لاتعداد واقعات شامل نہیں ہوں گے جو اگر رونما ہو جاتے تو کوئی اور ہی نتیجہ ہوتا۔

انسانی ذہن میں، رونما نہ ہوسکنے والے واقعات کا احاطہ کرنے کی زیادہ صلاحیت نہیں ہے۔ یہ حقیقت کہ رونما ہونے والے اکثر واقعات میں انسانی انتخاب بھی شامل تھے، آپ کو مہارت کا کردار مزید بڑھا چڑھا کر بیان کرنے اور قسمت کا کردار چھوٹا کر کے دکھانے پر اکساتی ہے۔ ہر اہم فیصلے کا نتیجہ اچھا ہی نکلنے سے منصوبہ بندی کے کمال کا تصور پیدا ہوتا ہے مگر بدقسمتی کسی بھی کامیاب قدم کو ناکام بھی تو بنا سکتی تھی۔

کامیابی اور قسمت-خلاصۂ بحث

خلاصۂ بحث یہ کہ انسان کے اپنی قسمت کا مالک ہونے کا نظریہ Over-simplistic اور بالکل مضحکہ خیز ہے جس کی کوئی علمی دلیل موجود نہیں ہے جبکہ اس پر یقین رکھنے کے اخلاقی اور سماجی نتائج سنگین ہوسکتے ہیں۔ انسان کے اندر فطری طور پر کوشش کا ایک داعیہ پایا جاتا ہے جو انسان کیلئے کافی ہے۔ اول تو اسے لغو

نظریات کے سہارے بڑھایا نہیں جا سکتا (یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ موٹیویشنل تقریروں کا اثر بس کچھ دیر کیلئے ہوتا ہے اور اس کے بعد انسان کا موٹیویشنل لیول پرانی سطح پر آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ Steve Salerno کہتا ہے کہ امریکہ میں سیلف ہیلپ لٹریچر کی بھرمار کے باوجود امریکی پہلے سے مقابلے میں زیادہ امیر یا کامیاب نہیں ہوئے) لیکن بالفرض محال اگر کچھ کیسز میں بڑھایا بھی جا سکتا ہو تو بھی ان نظریات کے فوائد کے مقابلے میں نقصانات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا پرچار نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

خیالات کی طاقت

خیالات کی طاقت کے متعلق دعوے

ذہن اور خیالات کو Success Literature میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بہت ساری کتابوں کے نام میں ہی Thinking,Brain,Think یا اسی سے ملتے جلتے الفاظ شامل ہیں۔ جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر ہوا ہے کہ Success Literature کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ انسان اپنی قسمت کا خود مالک ہے اور چاہے تو اپنی زندگی کو بدل سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی کو بدلنے کا یہ پراجیکٹ ہماری سوچ یا دماغ سے شروع ہوتا ہے۔ جب ہم اپنی سوچ کو بدلتے ہیں تو ہماری زندگی بدلنا شروع ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ غریب ہیں اور صرف جل کڑھ رہے ہیں تو آپ کے حالات نہیں بدل سکتے۔ تاہم اگر آپ اپنی سوچوں کو بدل کر مثبت کر لیں اور سوچیں کہ آپ اپنے حالات بدل سکتے ہیں اور آپ امیر ہو سکتے ہیں تو پھر واقعی آپ کے حالات بدلنے شروع ہو جائیں گے۔

اس سوال کا جواب کہ مثبت سوچیں کس طرح سے آپکی زندگی بہتر بناتی ہیں، دو طرح سے دیا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مثبت سوچ آپکو محنت کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ مثلاً اگر آپ بدحال ہیں اور ساتھ میں یقین کیے بیٹھے ہیں کہ آپ کے حالات نہیں بدل سکتے تو پھر آپ ان کو بدلنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے۔ اسکے برعکس اگر آپ یہ سوچیں کہ نہیں میرے حالات بدل سکتے ہیں تو پھر آپ انکو بدلنے کیلئے کوشش کرنا شروع کر دیں گے اور اس کوشش کے نتیجے میں آپ کے حالات واقعی بدل جائیں گے۔ تاہم چونکہ اس تصور میں کوئی زیادہ جادوئی کشش نہیں ہے اور یہ کامیابی کی ضمانت بھی نہیں دیتا یعنی ہو سکتا ہے کہ آپ کوشش کریں لیکن کامیاب

نہ ہوں لہذا ایک دوسرا تصور زیادہ مقبول ہے جسکی انتہائی شکل "لاء آف اٹریکشن" ہے جس کے مطابق آپ جو سوچتے ہیں کائنات وہی آپکو لوٹاتی ہے۔آپ اچھا سوچیں، آپکو اچھا ملے گا۔ برا سوچیں، برا ملے گا۔آپ سوچیں کہ آپ امیر ہو جائیں گے تو آپ واقعی امیر ہو جائیں گے۔آپ یہ سوچیں کہ آپ غریب ہی رہیں گے تو آپ غریب ہی رہیں گے۔تو آپ ہمیشہ Optimistic رہیں، Positive سوچیں تو آپ خوشحال رہیں گے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے دماغ کی صلاحیت بڑھا بھی سکتے ہیں اور اسکی اپنی پسند کی پروگرامنگ بھی کر سکتے ہیں۔یوگا، مراقبہ، Visualization اور این ایل پی جیسی چیزیں اسی لیے ہیں۔

امید پرستی کے نقصانات

یہ بڑے خوش کن اور حوصلہ بڑھانے والے دعوے اور نظریے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ صریحاً غلط ہیں یا انتہائی مبالغہ آمیز۔ مثال کے طور پر Success Literature میں اکسیر کے طور پر پیش کی جانے والی Optimism اور Positive Thinking وغیرہ کو ہی لے لیجئے۔ان کے فوائد سے کلی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ ایسی کوئی خوبی نہیں جو ہر حال میں ہر کسی کیلئے مفید ہو۔

Optimism کے متعدد نقصانات معلوم حقیقت ہیں۔مثلاً Gibson اور Sanbonmatsu نے مختلف تجربات کیے جس سے معلوم ہوا کہ Optimist لوگوں کے جوا کھیلتے رہنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک سٹڈی میں یہ بھی معلوم ہوا کہ Optimists سرمایہ کاری کے زیادہ Risky انتخابات کرتے ہیں۔ان دونوں چیزوں کے ممکنہ نقصانات زیادہ وضاحت طلب نہیں ہیں۔

جیمس شیفرڈ وغیرہ نے ایک حالیہ آرٹیکل میں متعدد سٹڈیز کا حوالہ دیا ہے جس سے Optimism کے ممکنہ نقصانات معلوم ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک سٹڈی میں معلوم ہوا کہ جو طلبہ ٹیسٹ میں اچھی کارکردگی کے متعلق زیادہ پر یقین تھے وہ ٹیسٹ میں اپنی اصل کارکردگی کے بارے میں جان کر زیادہ مایوس ہوئے۔

اسی طرح سے ایک سٹڈی کچھ اور طلبہ پر کی گئی جو پڑھائی میں اچھی کارکردگی دکھانے کے متعلق بہت پر یقین تھے۔ ان کے Optimism نے کارکردگی تو بہتر نہیں بنائی البتہ جوں جوں وقت گزرتا گیا انکا Self Esteem کم ہوتا گیا۔ کچھ سٹڈیز سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زیادہ Optimist لوگوں کے سگریٹ نوشی چھوڑنے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو شراب نوشی چھوڑنے کے بارے میں زیادہ پر یقین تھے وہ ایک سال بعد کم پر امید لوگوں کے مقابلے میں زیادہ شراب پی رہے تھے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ بیماریوں سے بچنے کے متعلق زیادہ پر یقین ہوتے ہیں وہ اس کیلئے احتیاطی تدابیر کم اختیار کرتے ہیں۔

صرف یہی نہیں کہ Optimism کے اپنے کچھ نقصانات ہیں بلکہ اس کے کچھ مبینہ فوائد کا بھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ مثال کے طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کینسر کے مریض امید قائم رکھیں تو وہ صحت یاب ہو سکتے ہیں، تاہم سٹڈیز میں اس کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں مل پایا۔ مثال کے طور پر پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا مریضوں کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ پُرامیدی کا صحتیابی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ایک سٹڈی میں تو یہ بھی معلوم ہوا کہ "برائٹ سائیڈ" دیکھنے والے مریضوں کی حالت دوسروں سے زیادہ بری تھی۔ اسی طرح ایک سٹڈی کے نتائج کے مطابق Optimism اور مدافعت کے درمیان بھی معکوس تعلق پایا جاتا ہے۔

کیا امید پرستی مریضوں کیلئے سودمند ہے؟

یہ درست ہے کہ کچھ ایسی سٹڈیز کے نتائج بھی شائع ہوئے ہیں جن میں مریضوں کیلئے Optimism کے فوائد بھی نظر آتے ہیں تاہم ایک تو جیسا کہ متعدد سکالرز نے نشاندہی کی ہے ان کی Methodology پر متعدد سوال اٹھائے جا سکتے ہیں۔ دوسرا اگر ان کو درست بھی مان لیا جائے تو یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے کہ صحتمندی Optimism کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحتمندی کے نتیجے کے طور پر Optimism پیدا ہوتا ہو۔ (یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ بعض طریقوں سے دو چیزوں کے

درمیان سبب اور اسلوب کا تعلق متعین کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ مثلاً مسبوب فرض کیجئے کہ آپ کسی سوالنامے کے ذریعے 100 لوگوں کا Optimism لیول معلوم کرتے ہیں اور پھر ان کا بلڈ پریشر ماپتے ہیں۔ اب ان دونوں مقداروں کو اگر آپ ایک گراف پر پلاٹ کریں تو آپ کو نظر آئے کہ جن جن لوگوں کا Optimism لیول زیادہ ہے انکا بلڈ پریشر نارمل یا اس کے قریب قریب ہے اور جن جن کا کم ہے ان کا بلڈ پریشر نارمل سے اوپر یا نیچے ہو تو آپ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ Optimism سے صحتمندی پیدا ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صحتمندی سے Optimism پیدا ہوتا ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں کسی اور چیز کی وجہ سے پیدا ہوتے ہوں جو آپکی سٹڈی میں ہی شامل نہیں۔) تیسرا یہ کہ اگر تو ایسا ہو کہ صحتمندی اور Optimism کے درمیان بلا استثناء ہر سٹڈی میں راست تناسب پایا جائے پھر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ہے لیکن اگر ایسا ہو کہ کچھ سٹڈیز میں یہ تعلق پایا جائے اور کچھ میں نہ پایا جائے جیسا کہ درپیش معاملے میں ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ہر Situation میں Optimism/Positive Thinking مفید نہیں ہے۔

امید پرستی کے مزید نقصانات

Daniel Kahneman نے Optimism کے متعدد فوائد کے ساتھ کئی نقصانات بھی گنوائے ہیں۔ مثلاً ایک سٹڈی میں پتا چلا کہ کچھ مصنوعات کے موجدین کو جب بتایا جاتا ہے کہ ان کی ایجاد نہیں چل سکتی تو کم لوگ Optimistic چھوڑ جاتے لیکن زیادہ Optimistic اسے چلانے کی کوشش کرتے اور نتیجتاً دوگنا نقصان اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح اس نے نشاندہی کی ہے کہ Optimistic ہونے کا ایک نقصان یہ ہے کہ انسان مقابلے کو نظر انداز کر دیتا ہے اور نقصان اٹھاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> I have had several occasions to ask founders and participants in innovative start-ups a question: To what extent will the outcome of your effort depend on what you do in your firm? This is evidently an easy question; the answer comes quickly and in my small sample it has

never been less than 80%. Even when they are not sure they will succeed, these bold people think their fate is almost entirely in their own hands. They are surely wrong: the outcome of a start-up depends as much on the achievements of its competitors and on changes in the market as on its own efforts........ [E]ntrepreneurs naturally focus on what they know best—their plans and actions and the most immediate threats and opportunities, such as the availability of funding. They know less about their competitors and therefore find it natural to imagine a future in which the competition plays little part.

مجھے کئی مرتبہ نوآموز، تخلیقی کاروبار کے بانیوں اور شریک کاروں سے یہ پوچھنے کا موقع ملا ہے کہ ان کے خیال میں انکے کاروبار کی کامیابی کا ان کی محنت پر کس حد تک انحصار ہے؟ بظاہر یہ بہت آسان سوال ہے کیونکہ اب تک مجھے ایسا کوئی نہیں ملا جس نے اس کا جواب 80 فیصد سے کم دیا ہو۔ اگر انہیں اپنی کامیابی کا یقین نہ بھی ہو تب بھی وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کی قسمت انکے آپ اپنے ہی ہاتھ میں ہے۔ یہ خیال قطعی طور پر غلط ہے کیونکہ انکے کاروبار کی کامیابی کا منڈی میں ہونے والی تبدیلیوں اور انکے حریفوں کی کامیابی یا ناکامی پر بھی اتنا ہی انحصار ہے جتنا کہ انکی اپنی کوششوں پر۔ یہ لوگ جبلی طور پر صرف ان چیزوں پر زیادہ دھیان دیتے ہیں جنہیں وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں یعنی ان کے اپنے منصوبے اور بالکل فوری نوعیت کے مواقع اور خطرات جیسے کہ رقم کی فراہمی۔ اس کے مقابلے میں وہ اپنے حریفوں کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں لہذا فطری طور پر وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ انکے مستقبل میں ان کے حریفوں کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔

Kahneman نے مختلف تحقیقات کے حوالے سے Optimism سے پیدا ہونے والے

Overconfidence کی بنیاد پر غلط پیش گوئیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک سٹڈی میں پتا چلا کہ کمپنیوں کے حد سے زیادہ پر اعتماد CFOs کی فنانشل مارکیٹ کے بارے میں اکثر پیش گوئیاں غلط ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک سٹڈی سے یہ بھی پتا چلا کہ تجربہ کار معالج جو اپنے تجربے کی بنیاد پر اپنی تشخیص کے درست ہونے پر مکمل یقین رکھتے تھے 40 فیصد کیسز میں انکی تشخیص غلط ثابت ہوئی۔ Kahneman اس کے مضمرات کے بارے میں لکھتا ہے:

> Organizations that take the word of overconfident experts can expect costly consequences. The study of CFOs showed that those who were most confident and optimistic about the S&P index were also overconfident and optimistic about the prospects of their own firm, which went on to take more risk than others. As Nassim Taleb has argued, inadequate appreciation of the uncertainty of the environment inevitably leads economic agents to take risks they should avoid. However, optimism is highly valued, socially and in the market; people and firms reward the providers of dangerously misleading information more than they reward truth tellers.

جو تنظیمیں اس طرح کے حد سے زیادہ پر اعتماد ماہرین کے مشوروں پر عمل کرتی ہیں انہیں اس کے نتائج بھگتنے کیلیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ مالی امور کے مسئولین والی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ جو مسئولین ایس اینڈ پی (ایک کریڈٹ ریٹنگ ایجنسی) کے اعشاریے کے بارے میں زیادہ پر امید تھے وہ اپنی کمپنیوں کے متعلق بھی حد سے زیادہ پر اعتماد تھے اور نتیجتاً انہوں نے زیادہ خطرات مول لیے۔ نسیم طالیب کہتا ہے کہ صورتِ حالات کی غیر یقینیت کا نامکمل ادراک معاشی عاملوں کو وہ خطرات بھی مول لینے پر اکساتا ہے جن سے

بچنا چاہیے۔ تاہم منڈی اور معاشرے دونوں میں امید پرستی کے ہی خریدار زیادہ ہیں۔ کمپنیاں اور لوگ دونوں سچ بتانے والوں سے زیادہ گمراہ کن معلومات دینے والوں کو نوازتے ہیں۔

اسی بنیاد پر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ:

In terms of its consequences for decisions, the optimistic bias may well be the most significant of the cognitive biases.

فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے اعتبار سے امید پرستی کی طرف حد سے بڑھا ہوا میلان غالباً ایسے دوسرے تمام میلانات سے زیادہ طاقتور ہے۔

خوشی کی مثال

اس کو بالواسطہ طور پر Happiness کی مثال کے ذریعے سے بھی پرکھا جا سکتا ہے کیونکہ Happiness کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ یہ مثبت احساسات کی موجودگی، منفی احساسات کی کمی اور Satisfaction کا مجموعہ ہے۔

June Gruber, Iris Mauss اور Maya Tamir اپنے آرٹیکل A Dark Side of Happiness کی ابتدا میں لکھتی ہیں:

Might happiness be dysfunctional at times? At first glance, the answer to this question would appear to be "no". Indeed, there is a strong popular and scientific emphasis on happiness as a source of beneficial outcomes, as evidenced by the increasing demand for motivational speakers, life coaches, and self-help books whose primary function is to increase happiness.

کیا خوشی بھی کچھ حالات میں ناکاری کا باعث ہو سکتی ہے؟ پہلی نظر میں اس کا جواب نہ

میں ہی ہوسکتا ہے کیونکہ سائنسی اور مقبول تصور میں سارا زور خوشی کے فوائد پر ہی ہے اسی لیے تو موٹیویشنل سپیکرز، مربیوں، لائف کوچز اور سیلف ہیلپ کتابوں جن کا مقصد ہی خوشی کو بڑھانا بتایا جاتا ہے کی اتنی مانگ ہے۔

مثبت سوچوں اور جذبات کے نقصانات

آگے چل کر انہوں نے مختلف سٹڈیز کا حوالے سے Feelingsاور Positive Mood کے متعدد نقصانات گنوائے ہیں۔ مثلاً:

- درمیانے درجے کے مثبت احساسات اور جذبات تو Creativity بڑھاتے ہیں لیکن اونچے درجے کے مثبت جذبات نہیں بڑھاتے۔
- ایسے لوگ جن میں مثبت جذبات کے مقابلے میں منفی جذبات کی بہت کمی ہو (5 کے مقابلے میں 1) ان کے رویوں میں جمود پیدا ہو جاتا ہے۔
- انتہائی خوش نظر آنے والے بچوں کی موت کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔
- بہت زیادہ مثبت جذبات رکھنے والے افراد کے بسیار خوری، شراب نوشی اور منشیات کی لت میں مبتلا ہو جانے کا امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔
- بہت زیادہ خوش لوگ خطرات کو زیادہ نظر انداز کرتے ہیں۔
- بہت زیادہ مثبت جذبات Mania پیدا کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔
- منفی جذبات کی عدم موجودگی کا Psychopathy خصوصاً ایذا رسانی کے جذبے کے ساتھ بھی تعلق ہے۔
- جو لوگ Happiness / Positive Feelings کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان میں ڈپریشن کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

o Happiness کو زیادہ اہمیت دینے والے لوگوں میں تنہائی کا احساس بھی بڑھ جاتا ہے۔

اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتی ہیں:

In sum, it appears that an excessive degree of happiness –manifested as a heightened degree of positive emotion and/or relative absence of negative emotion– can lead to undesirable outcomes in healthy populations and is also associated with psychological dysfunction in clinical populations.

خلاصہ یہ کہ یوں لگتا ہے کہ حد سے زیادہ خوشی یعنی مثبت جذبات کی بھرمار اور منفی جذبات کی عدم موجودگی سے صحت مند لوگوں کیلئے نامطلوب نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مختلف (ذہنی) امراض میں مبتلا لوگوں میں بھی اس کے اثرات پائے گئے ہیں۔

منفی سوچوں اور جذبات کے فوائد

یہاں ایک اور دلچسپ پہلو کا ذکر بھی ضروری ہے کہ متعدد سٹڈیز سے منفی سوچوں کے کچھ فوائد کا بھی پتا چلا ہے۔ مثال کے طور پر ایک سٹدی میں کچھ لوگوں کو Panic Situations میں رکھ کر ان کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ جو لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ وہ یہ صورتِ حال بدل سکتے ہیں وہ زیادہ مایوس اور ڈپریس ہوئے جبکہ جن لوگوں نے سپر ڈال دی تھی وہ کم دماغی تکلیف میں مبتلا ہوئے۔ اسی طرح ایک سٹڈی میں کچھ لوگوں میں Acceptance کا لیول (یعنی وہ حالات کو بدلنے کی کوشش کے بجائے کس حد تک ان کو قبول کر لیتے ہیں) ماپا گیا اور چند ماہ بعد ان کا ڈپریشن لیول ماپا گیا تو معلوم ہوا کہ جن لوگوں کا Acceptance لیول زیادہ تھا ان میں ڈپریشن کی علامات کم پائی گئیں۔ متعدد دیگر سٹڈیز کے نتائج سے بھی اس بات کی توثیق ہوئی

قسمت کی حاکمیت کے نظریے پر یقین رکھنے سے بدعملی اور ترکِ محنت لازم نہیں آتے۔

ہے۔ کچھ سٹڈیز سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نیگیٹو سوچ رکھنے والے افراد کی یادداشت بہتر ہوتی ہے، وہ زیادہ عملیت پسندانہ سوچ رکھتے ہیں اور بہتر طور پر Communicate کر سکتے ہیں۔

گروبر وغیرہ نے متعدد ایسی سٹڈیز کا حوالہ بھی دیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ منفی جذبات کے کچھ حالات میں فوائد بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک سٹڈی میں پتا چلا کہ تصادم کی صورت حال میں غصہ ایک کارآمد جذبہ ہے۔ اسی طرح کچھ سٹڈیز سے معلوم ہوا ہے کہ Guilt اور Embarrassment جیسے جذبات، تعاون، دلجوئی اور سماج دوست Pro-Social رویے پیدا کرنے میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔

کیا موٹیویشنل سپیکنگ کوئی فائدہ دیتی ہے؟

اس کے علاوہ کچھ سٹڈیز ایسی ہیں جو موٹیویشنل سپیکنگ کی افادیت پر بہت بڑا سوالیہ نشان اٹھا دیتی ہیں کیونکہ ان سٹڈیز سے پتا چلا ہے کہ تقریروں سے کسی کو زبردستی مثبت خیالات اپنانے پر مجبور کرنا فائدے کے بجائے نقصان کا سبب ہوتا ہے۔ ایک سٹڈی میں پہلے لوگوں کا Self Esteem ماپا گیا اور پھر ان سے کہا گیا کہ وہ یہ فقرہ بار بار دہرائیں کہ I am a lovable person۔ بعد میں دوبارہ ماپا گیا تو پتا چلا کہ جن لوگوں کا Self Esteem پہلے کم تھا یہ فقرہ دہرانے کے بعد مزید کم ہو گیا جبکہ جن لوگوں کا پہلے بہتر تھا اس کے بعد تھوڑا مزید بہتر ہو گیا۔ گویا کہ جن لوگوں کا Self Esteem کم ہے اگر وہ موٹیویشنل سپیکرز کے نسخوں کے مطابق بڑھانے کی کوشش کریں تو بڑھنے کے بجائے مزید کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک سٹڈی میں لوگوں کے دو گروپس کو ایسا میوزک سننے کو دیا گیا جو مبہم قسم کا تھا یعنی صاف طور پر پتا نہیں چلتا تھا کہ خوش کن ہے یا غمزدہ کرنے والا۔ ایک گروپ کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس کو سن کر زیادہ سے زیادہ خوشی محسوس کرنے کی کوشش کریں جبکہ دوسرے گروپ کو ایسی کوئی ہدایت نہیں دی گئی۔ بعد میں جب پتا کیا گیا تو معلوم ہوا کہ جس گروپ کو خوشی محسوس کرنے کی ہدایت کی گئی تھی وہ دراصل اس گروپ سے جس کو ایسی کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی کم خوشی محسوس کر رہا تھا۔ ان اسٹڈیز سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ جو لوگ پوزیٹو فیل نہیں

کر رہے ان کو ایسا کروانے کی کوشش کی جائے تو وہ مزید نیگیٹو فیل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دوم یہ کہ بالعموم اگر کسی کو ہدایات دے کر پوزیٹو فیل کروانے کی کوشش کی جائے تو اس کا بھی الٹا ہی اثر ہوتا ہے۔

اوسط سے ذرا سی بھی زیادہ ذہانت یا حساسیت رکھنے والے تمام لوگ زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ایک Existential Crisis کی سی کیفیت میں سے ضرور گزرتے ہیں جہاں خود اپنا وجود انتہائی بے معنی، فضول اور بے کار معلوم ہوتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور زندگی ایک بوجھ محسوس ہوتی ہے۔ یوں تو مجھے موٹیویشنل سپیکنگ اور سیلف ہیلپ قسم کی چیزیں شروع سے ہی کچھ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی تھیں لیکن ان سے نفرت مجھے اس وقت ہوئی تھی جب میں خود اس مرحلے سے گزر رہا تھا۔ میرے اردگرد بکھرے ناصحین عبادت سمجھ کر مجھے خوش امیدی اور "پوزیٹو تھنکنگ" کی تلقین کرتے تھے اور میرا جی انکا سر پھاڑنے کو کرتا تھا۔ اس کی وجہ مجھے بہت عرصے بعد اس طرح ایکسپریمنٹل ریسرچ کے نتائج پڑھ کر معلوم ہوئی کہ اس قسم کی چیزیں صرف انہی لوگوں کو اپیل کرتی ہیں جو پہلے ہی نسبتاً اچھے موڈ میں ہوتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ڈپریشن کی کیفیت میں ہوں تو اس قسم کی "پوزیٹو تھنکنگ" اور خوش امیدی ان کی اس کیفیت کو سوا ہی کرتی ہے۔ گویا وہ لوگ جو "لائف کوچ" کے منصب پر فائز ہو کر لوگوں کے ڈپریشن کا "پوزیٹو تھنکنگ" کے ذریعے بزعم خویش علاج کر رہے ہوتے ہیں وہ دراصل لوگوں کو خودکشی کی جانب دھکیل رہے ہوتے ہیں۔

کیا امید پرستی بالکل بے فائدہ ہے؟

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں Positive Thinking / Optimism یا خود اعتمادی کا فوائد کا انکار نہیں کر رہا۔ امید انسان کی تشکیل میں شامل خوبصورت ترین اور شاید طاقتور ترین اجزاء میں سے ہے اور اس کے فوائد بے شمار ہیں۔ تاہم جیسا کہ اوپر ہونے والی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ Excess of Everything is Bad کا اصول امید پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ جس طرح حد سے بڑھ جانے پر راست گوئی بداخلاقی، مصلحت منافقت اور بہادری بے وقوفی بن جاتی ہے اسی طرح امید حد سے بڑھ جائے تو

Delusion بن جاتی ہے اور فائدہ کے بجائے نقصان دیتی ہے۔ مزید یہ کہ جس طرح امید کی افادیت ہے اسی طرح دوسرے جذبات، احساسات، Instincts اور ذہنی حالتوں کی بھی ایک افادیت ہے جو مخصوص Situations میں نمایاں ہوتی ہے، جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا۔ امید پرستی پر بے جا اصرار شخصیت میں ان تمام چیزوں کے توازن کو بگاڑنے کا باعث بنتا ہے جو انجام میں برا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ کہ جیسا Daniel Kahneman کہتا ہے کہ عموماً انسان پیدائشی طور پر ہی اس حد تک Optimist ہوتا ہے کہ اکثر Optimism ایک باقاعدہ Cognitive Bias کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ہماری سوچ اور فیصلوں پر منفی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمیں اس کے خطرات سے آگاہ رہنا چاہیے نہ کہ اس کو مزید بڑھاوا دینے کی فکر کی جائے۔

لاءآف اٹریکشن کا فریب

موجودہ دور میں Positive Thinking کی تحریک کو نام نہاد Law of Attraction کی بازیافت نے خاص طور پر بڑھاوا دیا ہے۔ ویسے تو یہ خیال ایک صدی سے بھی زیادہ پرانا ہے لیکن 2006 میں Rhonda Byrne نے اپنی کتاب The Secret اور اسی نام کی ڈاکیومنٹری کے ذریعے اسے دوبارہ شہرت دی۔ یہ Law کچھ یوں ہے کہ آپ کے خیالات کی ایک فریکونسی ہوتی ہے، جو کچھ آپ سوچتے ہیں کائنات سے اسی فریکونسی والی چیزیں اور واقعات آپ کی طرف لوٹتے ہیں۔ لہٰذا آپ کو ہمیشہ مثبت سوچنا چاہیے۔ اس طرح آپ کے ساتھ مثبت واقعات ہی پیش آئیں گے۔

کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ اگرچہ اس میں بہت Intuitive Appeal ہے مگر دو چیزیں ایسی ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے درست ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک یہ کہ اس دعوے کی کوئی سائنسی بنیاد موجود نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ اس بات کی بڑی آسانی سے وضاحت کی جا سکتی ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ کیوں درست پر معلوم ہوتا ہے۔

سائنسی طور پر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ ہمارے خیالات طبعی دنیا پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ Mind-Matter ریسرچ میں ایسے دعوے ضرور کیے گئے ہیں کہ انسانی خیالات کسی Random تجربے کے نتائج پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ مثلاً اگر Dice پھینکنے والا سوچے کہ فلاں نمبر آئے گا اور وہی نمبر آئے، تاہم ایسے دعوے بہت متنازعہ ہیں اور ان کی صحت پر شدید اعتراضات کیے گئے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بات کا فی الوقت ثبوت نہ ہونا اسکے لازمی طور پر غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتی لیکن ایک تو اس صورت میں اسے لازمی طور پر درست ماننے پر بھی اصرار نہیں کیا جاسکتا اور دوسرا یہ کہ جس مشاہدہ کی Explanation کیلیے یہ دعویٰ کیا جارہا ہو اسکی ایک متبادل اور بہتر Explanation بھی موجود ہو تو اس کی صحت مزید مشکوک ہوجاتی ہے۔

لاء آف اٹریکشن کے درست ہونے پر لوگوں کے یقین کرنے کی سب سی بڑی وجہ ان کا ذاتی مشاہدہ ہوتا ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ آپ کسی چیز کے بارے میں سوچتے ہیں اور وہ ہوجاتی ہے۔ اگر آپ نے لاء آف اٹریکشن کا سن رکھا ہو تو رفتہ رفتہ آپ کو یقین آنے لگتا ہے کہ یہ واقعات آپکی سوچ کے تابع ہی ہورہے ہیں لیکن اس کی ایک اور Explanation بھی ہوسکتی ہے۔ دراصل ہمارا دماغ ایک طرف تو مبہم اور غیر یقینی صورت حالات کو پسند نہیں کرتا اور Understanding چاہتا ہے لیکن دوسری طرف اسکی بہت ساری چیزوں کو بیک وقت توجہ دینے، محفوظ رکھنے اور پراسیس کرنے کی صلاحیت محدود ہے (توجہ دینے کی محدود صلاحیت کا اندازہ اس چیز سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک تجربے میں لوگوں کو ایک ویڈیو دکھائی گئی اور انہیں یہ گول دیا گیا کہ وہ سفید شرٹ میں ملبوس باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کے Passes گنیں۔ ویڈیو کے درمیان میں سیاہ گوریلے کے لباس میں ملبوس ایک خاتون نمودار ہوتی ہے، کیمرے کی طرف منہ کرکے اپنا سینہ پیٹتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ تاہم ویڈیو

دراصل محنت کا صرف دنیاوی خوشحالی کے حصول کا ایک ذریعہ ہونے کا تصور نسبتاً جدید ہے ورنہ تاریخی طور پر تو محنت کا تصور نتائج سے قطع نظر ایک اخلاقی قدر کا رہا ہے

ختم ہونے کے بعد جب پوچھا گیا تو پتا چلا کہ اکثر لوگوں نے گوریلے کو نوٹ ہی نہیں کیا کیونکہ وہ ان کی ساری توجہ Passes پر تھی)۔ لہٰذا دماغ دستیاب انفارمیشن بہت سارے شارٹ کٹس اور Simplifying طریقوں کے ذریعے اس طرح پراسیس کرتا ہے کہ انڈرسٹینڈنگ کا Illusion قائم رہ سکے۔ ان میں سے صرف دو کے ذریعے لاء آف اٹریکشن کو اعتبار دینے والا سارا کھیل Explain کیا جاسکتا ہے۔

پہلی چیز Illusory Correlation ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دو واقعات ایک ساتھ ہو رہے ہوں تو دماغ انکے درمیان خواہ مخواہ ایک تعلق دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اس کے بارے میں متعدد تھیوریز موجود ہیں تاہم یہ ایک عام Phenomenon ہے اور اکثر لوگ اس کے وجود سے ناواقف ہوتے ہیں اور اس طرح کے دو چیزوں کے درمیان ناموجود تعلق پر یقین کیے رہتے ہیں۔ تاہم ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ اگر لوگوں کو اس کے بارے میں واقفیت بہم پہنچائی جائے تو اس قسم کے ناموجود تعلقات کو دیکھنا کم کر دیتے ہیں۔

دوسری چیز Confirmation Bias ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم لاشعوری طور پر صرف ان چیزوں کو یاد رکھتے اور اہمیت دیتے ہیں جو ان خیالات کی توثیق کرتی ہوں جن کو ہم درست مانتے یا پسند کرتے ہوں۔

Raymond Nickerson لکھتا ہے:

> In the aggregate, the evidence seems to me fairly compelling that people do not naturally adopt a falsifying strategy of hypothesis testing. Our natural tendency seems to look for evidence that is directly supportive of hypotheses we favor and even, in some instances, of those we are entertaining but about which are indifferent.

مجموعی طور پر مجھے اس چیز کا ثبوت ناقابلِ تردید معلوم ہوتا ہے کہ جبلی طور پر ہم مفروضوں

کے متعلق تردیدی حکمتِ عملی اختیار نہیں کرتے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا فطری میلان اپنے پسندیدہ مفروضوں کو درست ثابت کرنے والی چیزوں کی تلاش ہی کی طرف ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو ہم ایسے مفروضوں کے متعلق بھی یہی رویہ اختیار کرتے ہیں جن پر ابھی ہم غیر جانبداری کے ساتھ غور کر رہے ہوتے ہیں۔

لطف یہ ہے کہ ہمیں اس کا احساس کا نہیں ہوتا اور ہم یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہمارے تصورات بالکل منطقی اور غیر جانبدارانہ بنیادوں پر قائم ہیں۔ یہاں شاید کچھ لوگوں کو لگے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ تمام تفصیلات کو ٹھیک ٹھیک یاد رکھتے ہیں۔ ایک تو جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی ہے ہماری توجہ کی کچھ حدود ہیں اور ہم بہت ساری واضح چیزوں کو بھی دیکھنے اور یاد رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یادداشت کے متعلق دوسری اور اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ ہماری اپنے پرانے Beliefs یاد رکھنے کی صلاحیت بھی بہت محدود ہے۔ متعدد سٹڈیز سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سٹڈی ایسے لوگوں پر کی گئی جن کے شریکِ حیات کی موت واقع ہو چکی تھی۔ شریکِ حیات کی موت کے چھ ماہ بعد اور پھر پانچ سال بعد ان سے پوچھا گیا کہ وہ کتنے غمزدہ محسوس کر رہے ہیں۔ توقع کے مطابق چھ ماہ بعد وہ زیادہ اور پانچ سال بعد کم غم محسوس کر رہے تھے لیکن جب پانچ سال بعد جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ یاد کر کے بتائیں کہ شریکِ حیات کی موت کے چھ ماہ بعد آپ کتنا غم محسوس کر رہے تھے تو غم کی جو سطح انہوں نے بتائی وہ اس سے بہت کم تھی جو انہوں نے ساڑھے چار سال پہلے بتائی تھی۔

اسی طرح Kahneman نے کچھ سٹڈیز کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً جب نکسن چین کے دورے پر جا رہا تھا تو کچھ لوگوں سے پوچھا گیا کہ وہ بتائیں کہ مختلف واقعات کے ہونے کا کتنا امکان ہے جیسے کہ کیا ماؤ اور نکسن کی ملاقات ہوگی؟ کیا امریکہ چین کو بطور ریاست تسلیم کر لے گا؟ ہر سوال کیلئے لوگوں نے بتایا کہ ان کے خیال میں اس کے ہونے کے کتنے امکانات ہیں۔ دورہ ہو چکنے کے بعد جب تمام سوالوں کے جوابات مل گئے تو انہی لوگوں سے دوبارہ پوچھا گیا کہ آپ بتائیں کہ دورے سے پہلے آپکے مطابق اس چیز کے ہونے یا نہ

ہونے کا کتنا امکان تھا تو جو واقعات ہو گئے تھے ان کی بابت لوگوں کے خیال میں انہوں نے جو امکان بتایا تھا وہ ان کے اس وقت بتائے گئے اصل امکان سے زیادہ اور جو نہیں ہوئے تھے ان کی بابت اس وقت بتائے گئے اصل امکان سے کم تھا۔

یہاں یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ چلیے لاء آف اٹریکشن محض ایک Illusion ہی سہی لیکن اگر کوئی اس پر یقین رکھتا ہے تو اس میں نقصان کیا ہے؟ اول تو علمی طور پر غیر ثابت شدہ چیزوں پر یوں ہی یقین رکھنا ایک غیر صحتمندانہ رویہ ہے جسکے مزاج پر برے اثرات پڑ سکتے ہیں۔ دوم یہ کہ اس کے متعدد دوسرے نقصانات بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے کہ ہر طرح کے خیالات اور جذبات کی اپنی افادیت ہے اور ان کو زبردستی شخصیت سے نکال باہر کرنے سے انسان ان کے فوائد سے محروم ہو سکتا ہے۔ مثلاً آپ کو کسی بیماری کی ابتدائی علامات نظر آ رہی ہیں لیکن چونکہ آپ لاء آف اٹریکشن پر یقین رکھتے ہیں اس لیے اس کے برے نتائج کے بارے میں نہیں سوچتے اور اس کے علاج کا بندوبست نہیں کرتے تو اس صورت میں آپکو بیماری شدید صورت میں لاحق ہو سکتی ہے۔

برآں مزید لاء آف اٹریکشن کا ایک جزو Visualization ہے۔ یعنی آپ جو چیزیں حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے بارے تصور کریں۔ Rhonda Byrne لکھتی ہے:

> The reason visualization is so powerful is because as you create pictures in your mind of seeing yourself with what it is you want, you are generating thoughts and feelings of having it now. Visualization is simply powerfully focused thought in pictures, and it causes equally powerful feelings. When you are visualizing, you are emitting that powerful frequency out into the Universe. The law of attraction will take hold of that powerful signal and return those pictures back to you, just as you saw them in your mind.

تجسم فکری اس لیے اتنی طاقتور ہے کہ جب آپ اپنی من چاہی چیزوں کا تصور کرتے ہیں تو دراصل آپ کے خیالات اور احساسات ایسے ہو جاتے ہیں کہ جیسے وہ چیز ابھی سے آپ کو مل گئی ہو۔ تجسم فکری من چاہی تصویروں پر خیالات کا طاقتور ارتکاز ہے جس سے احساسات بھی اتنے ہی طاقتور پیدا ہوتے ہیں۔ جب آپ ایسا کر رہے ہوتے ہیں تو دراصل آپ ایک بہت طاقتور فریکونسی کائنات میں بھیج رہے ہوتے ہیں اور کشش کا قانون اسی فریکونسی کے مطابق وہ تصویریں آپ کو حقیقی صورت میں لوٹا دیتا ہے۔

Visualization کے نقصانات

لیکن ریسرچ کے نتائج بتاتے ہیں کہ Visualization کے کچھ نقصانات بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک سٹڈی سے معلوم ہوا کہ خوش کن قسم کی Fantasy میں مگن ہونے سے کام کرنے کیلئے درکار توانائی کم ہو جاتی ہے۔ ایک دوسری سٹڈی میں معلوم ہوا کہ جن طلبہ نے آغاز میں اپنی اچھی کارکردگی کے مطابق Visualize کیا ان کا کارکردگی کم ہوگئی۔ اسی طرح ایک اور سٹڈی میں معلوم ہوا کہ Visualization کے نتیجے میں خیرات دینے کا جذبہ کم ہوگیا۔

حاصلِ کلام یہ کہ لاء آف اٹریکشن کی علمی بنیادیں سخت مخدوش ہیں اور یہ محض مختلف ذہنی محدودات کا پیدا کیا ہوا سراب ہے جس کے پیچھے بھاگنے کے ممکنہ نقصانات خاصے زیادہ ہیں۔

کچھ وضاحتیں

کیا موٹیویشنل سپیکرز دھوکے باز ہیں؟

پچھلے ابواب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مروجہ Success Literature بالعموم نادرست اور مبالغہ آمیز دعووں پر مشتمل ہے اور اسکی افادیت مشکوک ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے کئی ممکنہ نقصانات بھی ہیں۔تاہم آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ایسا نہیں کہ تمام موٹیویشنل سپیکرز اس بات سے آگاہ ہونے کے باوجود اسی کا پرچار کیے جارہے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ ان کی اکثریت اس بات سے واقف ہی نہیں کہ وہ جن چیزوں کا پرچار کیے جارہے ہیں وہ مبالغے پر مبنی ہیں اور ان کے ممکنہ نقصانات بھی ہیں۔ میں ذاتی طور پر کچھ ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو بڑے خلوص سے یہ سمجھ کر اس لٹریچر کا پرچار کررہے ہیں کہ اس طرح وہ لوگوں کی زندگی میں تبدیلی پیدا کررہے ہیں۔ انکے خلوص کی ناقدری نہیں کی جانی چاہیے۔

میں ایک اور وجہ سے بھی ان لوگوں کو کسی حد تک قابلِ رعایت سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ Capitalism (اور متعلقہ تصورات جیسے جمہوریت، سیکولرزم) کے عروج کے نتیجے میں ترقی یافتہ ممالک میں متعدد افراد اور اداروں کو حاصل ہونے والی حیران کن کامیابی اور انسانی ذہن کے محدودات (جن میں سے کچھ کا ذکر پچھلے ابواب میں ہوا ہے) کے پیشِ نظر انسان کے اپنے قسمت کے مالک ہونے کا تصور پیدا ہونا بالکل فطری تھا۔ بالکل اسی طرح انسان کی ترقی کی خواہش کے زیرِ اثر کامیابی کے ''اصولوں'' اور نظریات کی تلاش کا عمل شروع ہونا، خواہش اور ذہن کے محدودات کے تعامل سے ان ''اصولوں'' کا ''دریافت'' ہوجانا اور ہوتے

رہتا، ان کی مانگ پیدا ہوتا، اس مانگ کو پورا کرنے والے اداروں اور افراد کا پیدا ہوتا اور مشہور ہوجانا، چھ انہی نظریات وخیالات کا ہمارے جیسے ملکوں میں برآمد ہوتا اور مشہور ہوتا۔۔۔۔ یہ سب بھی بالکل فطری تھا۔ (یہ Sequence بہت Over-simplistic ہے۔ اصل صورت حالات اس سے یقیناً بہت زیادہ پیچیدہ ہے تاہم ہمارے مقصد کیلئے فی الحال یہی کافی ہے۔ برسبیلِ تذکرہ، میرا اس Sequence کو دریافت کرنا اور بہت سے قارئین کو اس کا درست معلوم ہونا بھی ذہن کے محدودات کا کمال ہے)۔

موٹیویشنل سپیکنگ پر اعتراض کیوں؟

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سب ایسا ہی فطری ہے اور موٹیویشنل سپیکرز بھی خلوص کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہیں تو پھر اس پر اعتراض کرنے اور اس کا رد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اول تو کسی کے خلوص کے ساتھ کچھ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اسکا کوئی فائدہ بھی ہے یا اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اسکا خلوص، اس کے بارے میں ہماری رائے پر تو اثر انداز ہوتا ہے مگر اس کے کام کے نتائج پر نہیں۔ دوم یہ کہ بالکل اسی طرح کسی چیز کے بارے میں یہ معلوم ہو جانے سے کہ وہ کیوں اور کیسے ہو رہی ہے، یہ لازم نہیں آتا کہ وہ صحیح ہو رہی ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایسا کرنے والے کے بارے میں ہماری رائے ذرا نرم ہو جائے۔ اسی لیے میں موٹیویشنل سپیکرز کو کسی حد تک قابلِ رعایت تو سمجھتا ہوں مگر جن تصورات پر پچھلے ابواب میں تنقید کی گئی ہے وہ میری رائے میں غلط یا مبنی بر مبالغہ اور خطرناک ضرور ہیں۔

معروف تصورات کو رد کرنے سے پیدا ہونے والے سوالات

ان تصورات کو رد کرنے سے کچھ سوالات البتہ ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ کامیابی کے معروف تصور کے رد پر تو زیادہ لوگوں کو شاید اعتراض نہیں ہوگا لیکن قسمت کی حاکمیت کے نظریے کی تائید اور Optimism پر تنقید کے سبب پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات دینا ضروری ہے۔ یہ جوابات اگرچہ متعلقہ ابواب میں دیے

جا چکے ہیں لیکن ان کو دوبارہ بیان کرنا ضروری ہے تا کہ میرا نقطۂ نظر پوری طرح واضح ہو سکے۔

قسمت کی حاکمیت کے نظریے پر اعتراضات

Optimism پر تنقید اور انسان کے خود اپنی قسمت کے مالک ہونے کے بجائے قسمت کی حاکمیت کے نظریے کی تائید پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات کو بدلنے کوئی کوشش ہی نہ کی جائے اور بس مایوس ہو کے بیٹھ رہا جائے کیونکہ ہونا تو وہی ہے پہلے سے قسمت میں لکھا جا چکا۔ لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ تنقید صرف حد سے بڑھی ہوئی امید پرستی پر کی جا رہی ہے جو -- جیسا کہ مختلف تحقیقات کے نتائج سے معلوم ہوتا ہے -- خطرناک ہو سکتی ہے، ورنہ امید تو اس ترکیب کا جس سے انسان وجود میں آیا ہے، ایک جزوِ لاینفک ہے۔ بقول احمد جاوید صاحب مایوسی تو انسانی Perspective میں سرے سے کوئی چیز ہی نہیں ہے کیونکہ انسان مایوس ہونا جانتا ہی نہیں۔ اسی طرح سے میں اس خیال کو بھی درست نہیں سمجھتا کہ اگر انسان کو یہ بتایا جائے کہ ضروری نہیں کہ تمہاری محنت سے تمہاری قسمت بدل جائے گی تو وہ محنت کرنا چھوڑ دے گا۔ دراصل محنت کا صرف دنیاوی خوشحالی کے حصول کا ایک ذریعہ ہونے کا تصور نسبتاً جدید ہے ورنہ تاریخی طور پر تو محنت کا تصور نتائج سے قطع نظر ایک اخلاقی قدر کا رہا ہے۔ انسان فطری داعیات کے تحت محنت کرتا ہی رہے گا تاہم اگر وہ قسمت کی حاکمیت کے نظریے پر یقین رکھتا ہو گا تو نہ تو اپنی محنت کے من چاہے نتائج ملنے پر گھمنڈی اور بے حس ہو گا اور نہ ہی من چاہے نتائج نہ ملنے پر اپنی نظروں سے گرے گا۔

مزید یہ کہ اپنی قسمت کا معمار خود ہونے کے تصور یا کسی Hyper-Optimistic نظریے پر یقین رکھنے سے واقعی انسان اپنی قسمت کا معمار نہیں بن جاتا۔ کامیابی یا ناکامی سراسر ان اتفاقات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جو انسان کے بس سے باہر ہیں اور اس کا اپنے اختیار میں ہونا محض ایک Illusion ہے جو ہمارے دماغ کی محدود صلاحیتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ ان اتفاقات کو اگر آپ محض اتفاقات سمجھیں یا پھر خدا کی

جانب سے کی گئی Interventions ہر دو صورتوں میں اس چیز پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ان فیکٹرز پر ہے جو آپ کے بس سے باہر ہیں۔ قسمت کی حاکمیت کے نظریے کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس کا زور قسمت کے معمار ہونے کے نظریے کے برعکس Outcome یا نتیجہ پر نہیں بلکہ Process یا عمل پر ہے۔ آپ کو کامیابی نہیں ملی لیکن آپ نے محنت کی ہے تو اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں کیونکہ Outcome کا انحصار ان چیزوں پر تھا جو آپکے بس سے باہر تھیں۔

کیا کامیابی کے کوئی عمومی اصول ہیں؟

ایک اور اہم نکتہ جو پیچھے اخذ کیے گئے نتائج کی روشنی میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کامیابی اور ناکامی Random ہے اور کامیابی کے معیارات بھی ہر کسی کیلیے مختلف ہو سکتے ہیں تو پھر کامیابی کے نام نہاد عمومی "اصول" بھی بیکار ہی ہیں۔ یہ اصول تو یوں بھی بیکار ہیں کہ یہ مختلف عادات اور کامیابی کے درمیان ایک خیالی Correlation کی بنیاد پر اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کی تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے۔ فرض کر لیجئے کہ یہ اصول کسی "کامیاب" آدمی نے خود اپنی زندگی سے اخذ کیے ہیں تو بالکل ہی ناقابلِ اعتبار ہیں کیونکہ اپنے بارے میں سوچتے ہوئے ایک اور Bias بھی انسان کی سوچ پر اثر انداز ہونا شروع ہو جاتا ہے جسکو Self-serving Bias کہتے ہیں جسکے تحت انسان لاشعوری طور پر Self Esteem بڑھانے کیلیے عموماً اپنی کامیابیوں کو قابلیت کا اور ناکامیوں کو حالات کا نتیجہ سمجھتا رہتا ہے۔ اس گمان کو قائم رکھنے کیلیے

کامیابی کے چھ /سات/ دس Steps ' قسم کی چیزوں سے مجھے صرف اس لیے ہی اختلاف نہیں کہ وہ بیکار ہیں اور جن پر عمل سے کسی کو فائدہ نہیں ہوگا بلکہ اس لیے بھی کہ زندگی کی خوبصورتی اسکی پیچیدگی، بے یقینی، بے کرانی، ہمہ جہتی اور تموج میں ہے۔ اسے کسی Linear راستے پر چلانے کی کوشش اکثر ناکام رہتی ہے اور اسکے حسن کو بھی گہنا دیتی ہے۔

انسان پھر Selective Perception استعمال کرتا ہے یعنی وہ ان واقعات کو یاد رکھتا ہے جن سے اسکے اس خیال کا درست ہونا ظاہر ہوتا ہو جبکہ ان واقعات کو بھلا دیتا ہے جن سے اسکے خیال کا غلط ہونا ظاہر ہوتا ہو۔ اور اگر کسی نے بزعمِ خویش کامیاب لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کر کے اخذ کیے ہیں تو بھی ناقابلِ اعتبار ہیں کیونکہ آپ کسی کی پوری زندگی کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتے۔ آپ کے پاس تمام معلومات ہوتی ہی نہیں، اور ساری معلومات کے بغیر اور کسی فول پروف Methodology کے بغیر محض الل ٹپ کسی کی زندگی مطالعے سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہوں تقریباً یقینی ہے کہ ان پر بہت سے Biases اثر انداز ہوئے ہوں گے۔ (یہاں ضمناً ایک اور بات بھی کرنی ضروری ہے کہ ریسرچ یوں ہی الل ٹپ نہیں ہوتی بلکہ پہلے اسکو اس طرح ڈیزائن کیا جاتا ہے کہ Biases اس پر کم سے کم اثر انداز ہو سکیں۔ مزید یہ کہ قابلِ اعتبار ریسرچ عموماً Peer Reviewed Journals میں شائع ہوتی ہے۔ یہ وہ جرنلز ہوتے ہیں جہاں کسی ریسرچ کو شائع کرنے سے پہلے اس فیلڈ کے ماہرین سے Assess کروایا جاتا ہے اور اگر وہ کہیں کہ ہاں یہ ریسرچ بظاہر ٹھیک طریقے پر ہوئی ہے تو اسے Publish کیا جاتا ہے۔ لہذا کسی ریسرچ کے نتائج پر اعتبار کرنے سے پہلے یہ چیزیں دیکھ لینی چاہیے۔)

مزید یہ کہ جب ہم کسی کامیاب آدمی میں کچھ خصوصیات دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ ہو نہ ہو اسے کامیابی ضرور انہی خصوصیات کی وجہ سے ملی ہے۔ یہ ایک طرح کا فریبِ خیال ہے جسے نسیم طالیب Swimmer's Body Illusion کہتا ہے کیونکہ جیسا میں نے امید پرستی کے متعلق اشارہ کیا تھا کہ ضروری نہیں کہ امید پرستی سے صحتمندی پیدا ہوتی ہو عین ممکن ہے کہ صحتمندی سے امید پرستی پیدا ہوتی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ محض ایک ایسی خصوصیت ہو جسکا کامیابی یا ناکامی کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہ ہو۔

Rolf Dobelli اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> When I ask happy people about the secret of their contentment, I often hear answers like 'You have to see

the glass half-full rather than half-empty.' It is as if these individuals do not realise that they were born happy, and now tend to seethe positive in everything. They do not realise that cheerfulness – according to many studies, such as those conducted by Harvard's Dan Gilbert – is largely a personality trait that remains constant throughout life. Or, as social scientists Lykken and Tellegen starkly suggest, 'trying to be happier is as futile as trying to be taller.' Thus, the swimmer's body illusion is also a self-illusion. When these optimists write self-help books, the illusion can become treacherous. That's why it's important to give a wide berth to tips and advice from self-help authors. For billions of people, these pieces of advice are unlikely to help. But because the unhappy don't write self-help books about their failures, this fact remains hidden.

جب میں خوش لوگوں سے ان کے اطمینان کا راز پوچھتا ہوں تو وہ کچھ اس طرح کے جواب دیتے ہیں کہ آپ کو امید پرست ہو کر گلاس کو آدھا خالی کے بجائے آدھا بھرا ہوا دیکھنا چاہیے۔ یوں لگتا ہے کہ ان لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ چونکہ وہ پیدا ہی خوش مزاج ہوئے تھے اس لیے وہ ہر چیز کا مثبت پہلو دیکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ متعدد تحقیقات کے مطابق خوش مزاجی عام طور پر بعض انسانوں کی شخصیت کا حصہ ہوتی ہے جو تمام عمر کم و بیش ان کے ساتھ رہتی ہے۔ اسی لیے کچھ سماجی سائنسدان تو یہ بھی کہتے ہیں کہ خوشی میں اضافے کی کوشش قد میں اضافے کی کوشش کی طرح ہی بے کار ہے۔ اسی لیے یہ فریب خیال دراصل خودفریبی بھی ہے۔ اور جب اسطرح کے امید پرست سیلف ہیلپ کتابیں لکھتے ہیں تو یہ خودفریبی ایک طرح سے دھوکہ دہی بھی بن جاتی ہے۔ اس لیے

سیلف ہیلپ منصفین کے مشوروں سے بچ کے ہی رہنا چاہیے۔ اربوں لوگوں کو ان مشوروں سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا لیکن چونکہ قنوطیت پسند اپنی ناکامیوں کے متعلق سیلف ہیلپ کتابیں نہیں لکھتے اس لیے یہ حقیقت عیاں نہیں ہو پاتی۔

مرحلہ وار کامیابی

اکثر سپیکر حضرات اپنی ''تحقیق'' کی بنیاد پر کامیابی کے صرف عمومی اصول ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کامیابی کے مرحلہ وار نسخے بھی تجویز کرتے ہیں جو کہ ظاہر ہے انہی اصولوں کی طرح بے کار ہوتے ہیں۔ اس طرح کی کامیابی کے چھ/ سات/ دس Steps' قسم کی چیزوں سے مجھے صرف اس لیے ہی اختلاف نہیں کہ وہ بے کار ہیں جن پر عمل سے کسی کو فائدہ نہیں ہونے والا بلکہ اس لیے بھی ہے کہ زندگی کی خوبصورتی اسکی پیچیدگی، بے یقینی، بے کرانی، ہمہ جہتی اور تموج میں ہے اسے کسی Linear راستے پر چلانے کی کوششیں اکثر ناکام تو ہوتی ہی ہیں، اس کے حسن کو گہنا بھی دیتی ہیں۔

مغالطوں کی ایک بنیادی وجہ

حقیقت پہ پردہ پڑے رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر کامیاب پیشہ ور موٹیویشنل سپیکرز کی ابتدائی زندگی بہت عسرت میں گزری ہوتی ہے لیکن اپنی تحریروں اور تقریروں کی بدولت وہ نہ صرف مناسب دولت بلکہ اچھی خاصی شہرت بھی کما لیتے ہیں۔ اس سے انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہر کوئی اسی طرح اپنے حالات بدل سکتا ہے۔ ان کے سننے والے بھی جب انکی کہانی سنتے ہیں تو انہیں یقین آنا شروع ہو جاتا ہے کہ واقعی غربت کسی کا راستہ نہیں روک سکتی اور انسان اپنے حالات خود بدل سکتا ہے۔ تاہم وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موٹیویشنل سپیکر بننا اکثر کاموں سے آسان ہے اور اس میں کامیابی کا امکان باقی کاموں کی نسبت زیادہ ہے کیونکہ اس کے خریدار بہت ہیں۔ موجودہ دنیا میں دولت قریب قریب عزت کا اکیلا معیار سمجھ لی گئی ہے لہذا ہر کوئی اسے کمانے کے گر سیکھنا اور یہ یقین کرنا چاہتا ہے کہ وہ لامحدود دولت کما سکتا ہے۔ لہذا جو بھی خواب فروشی شروع

کردے اس کے پاس خریداروں کا ہجوم لگ جاتا ہے۔اس کے برعکس کسی بھی حقیقی کام،فرض کر لیجئے ایک ہوٹل شروع کر کے چلانے کیلیے اس سے کئی گنا زیادہ مہارت، محنت، وسائل اور خوش قسمتی چاہیے ہوتی ہے۔

خصوصیات اور کامیابی کا تعلق-ایک اور بنیادی غلطی

کامیاب لوگوں کی زندگی کے مطالعے سے اخذ کیے گئے کامیابی کے اصول اس لیے بھی ناقابلِ اعتبار ہیں کہ اس طرح کے مطالعے میں کامیاب لوگوں کی عادات کا ناکام لوگوں کی عادات سے موازنہ کیا ہی نہیں جاتا۔ نسیم طالیب اسے یوں واضح کرتا ہے:

> Numerous studies of millionaires aimed at figuring out the skills required for hotshotness follow the following methodology. They take a population of hotshots, those with big titles and big jobs, and study their attributes. The look at what those big guns have in common: courage, risk taking optimism, and so on, and infer that these traits, most notably risk taking help you to become successful. You would also probably get the same impression if you read CEOs' ghostwritten autobiographies or attended their presentations to fawning MBA students.
>
> Now take a look at the cemetery. It is quite difficult to do so because people who fail do not seem to write memoirs, and, if they did, those business publishers I know would not even consider giving them the courtesy

---

ایک تحقیق کے نتائج سے معلوم ہوا ہے کہ موٹیویشنل معلوم ہونے والے بالکل احمقانہ اور بے معنی اقوال کو ان لوگوں نے صحیح سمجھا اور متاثر کن کہا جن کی ذہانت کم تھی۔

---

of a returned phone call (as to returned e-mail, fuhgedit). Readers would not pay $26.95 for a story of failure, even if you convinced them that it had more useful tricks than a story of success. The entire notion of biography is grounded in the arbitrary ascription of a causal relation between specified traits and subsequent events. Now consider the cemetery. The graveyard of failed persons will be full of people who shared the following traits: courage, risk taking, optimism, et cetera. Just like the population of millionaires. There may be some differences in skills, but what truly separates the two is for the most part a single factor: luck. Plain luck.

امارت اور شہرت پیدا کرنے والی خصوصیات جاننے کیلئے عموماً یہ کیا جاتا ہے کہ امیر اور مشہور لوگوں کا ایک گروہ لیا جاتا ہے اور وہ خاصیتیں تلاش کیجاتی ہیں جو ان سب میں مشترک ہوتی ہیں۔ ایسی سٹڈیز کرنے والے عموماً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ چونکہ حوصلہ مندی، امید پرستی اور خطرات مول لینے کی عادت ان سب میں مشترک ہے لہذا یہی خصوصیات خاص طور پر خطرات مول لینے کی عادت ہی ان کی امارت وشہرت کی وجہ ہے۔ کامیاب منتظمین کی دوسروں سے لکھوائی ہوئی آپ بیتیاں پڑھتے ہوئے یا انکی ایم بی اے کے طلبہ کے سامنے کی جانے والی تقریریں سن کر بھی آپکو ایسا ہی تاثر ملے گا۔

اب ذرا ایک نظر ناکامی کے قبرستان پر بھی ڈالیے۔ لیکن یہ آسان نہیں ہوگا کیونکہ اول تو ناکام لوگ اپنی یادداشتیں لکھتے ہی نہیں اور اگر لکھیں بھی تو پبلشر حضرات انکو فون کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ اسی طرح قارئین بھی ناکامی کی کوئی کہانی پڑھنے کیلئے چھبیس اعشاریہ پچانوے ڈالر نہیں خرچ کرنے والے چاہے آپ انکو جتنا بھی قائل کریں

> کہ اس میں کامیابی کی کسی کہانی سے زیادہ مفید ترکیبیں موجود ہیں۔ درحقیقت آپ بیتاں لکھنے کا مقصد ہی بعض خصوصیات اور کامیابیوں کے درمیان بلاثبوت سبب اور نتیجے کا تعلق قائم کرنا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ ناکام لوگوں کے قبرستان پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی امیروں کے گروہ کی طرح آپ کو امید پرستی، حوصلہ مندی اور خطرات مول لینے والے بہت سے مل جائیں گے۔ کامیاب اور ناکام لوگوں کے درمیان مہارتوں کا کچھ فرق شاید ہوتا ہو لیکن ان کے درمیان فرق کرنے والی اصل چیز صرف اور صرف قسمت ہے!

کسی عادت کے متعلق یہ دعویٰ کہ اس سے کامیابی پیدا ہوتی ہے صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے جب وہ عادت کامیاب لوگوں میں ہمیشہ پائی جائے اور ناکام لوگوں میں کبھی نہ پائی جائے۔ لیکن ناکام لوگوں کی زندگی کی کہانیوں کو ایسی کوریج ملتی ہی نہیں کہ انکا مطالعہ کیا جا سکے نہ انکے مطالعے میں کسی کو دلچسپی ہے۔ تاہم اگر ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو راج مزدوروں سے لے کر رکشہ ڈرائیوروں تک انتھک محنت، نظم وضبط اور حوصلہ مندی سمیت قریب قریب تمام ہی مبینہ طور پر امارت خیز اوصاف سے متصف غریب لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں۔

کیا کامیابی کا کوئی عمومی تربیت کار ہو سکتا ہے؟

کامیابی کے ''اصولوں'' کی طرح میری رائے میں کوئی ایسا Coach بھی نہیں ہو سکتا جو ہر پروفیشن کے لوگوں کو کامیابی کے گر بتا سکے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ متعلقہ پروفیشن کا کوئی آدمی اسی پروفیشن کے لوگوں کامیابی کی کوشش کے کوئی ٹپس دے سکے۔ تاہم یاد رہے کہ یہ بھی محض ایک کوشش ہو گی جو کامیابی کی ضمانت نہیں ہے۔

برآں مزید، جیسا کہ بحث ہو چکی ہے کہ اول تو کامیابی کے کوئی عمومی اصول اور مشورہ کار ہو نہیں سکتے۔ بالفرض محال اگر ہوں بھی تو اسکا امکان کم ہے کہ ان کو سننے والوں کو کسی قسم کا فائدہ ہوتا ہو۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ جو لوگ

کسی موٹیویشنل سپیکر سے رجوع کرتے ہیں وہ اکثر وہی ہوتے ہیں جو پہلے بھی کر چکے ہوتے ہیں۔ بعض دعووں کے مطابق تو سیلف ہیلپ کے 80 فیصد گاہک بار بار پلٹ کر آنے والے ہی ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو ایسی باتیں سننے کا چسکا لگ جاتا ہے اور واقعی کسی قسم کا حقیقی کام کرنے کے بجائے ایک خوش کن تخیلاتی دنیا کے مکین بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس قسم کی باتوں سے متاثر ہونے میں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دخل ذہانت کی کمی کا بھی ہے۔ حال ہی میں (نومبر 2015) شائع ہونے والے ایک تحقیق کے نتائج سے معلوم ہوا ہے کہ موٹیویشنل معلوم ہونے والے بالکل احمقانہ اور بے معنی اقوال کو ان لوگوں نے صحیح سمجھا اور متاثر کن کہا جن کی ذہانت کم تھی۔

ایک سابق سیلف ہیلپ مصنفہ کے اعترافات

Michelle Goodman ایک سابقہ سیلف ہیلپ مصنفہ اور سپیکر ہیں۔ انہوں نے ایک بہت عمدہ آرٹیکل Confessions of a failed self-help guru لکھا ہے جس میں انہوں نے بڑی تفصیل سے اس کاروبار کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ چشم کشا حصہ کامیابی کے عمومی ٹوٹکوں کے متعلق ہی ہے۔ لکھتی ہیں:

> When the recession hit, my inbox filled with emails from people facing foreclosure and bankruptcy. People with unfathomable health problems and insurmountable piles of medical bills. One career advice columnist I knew had received letters from people asking if their family still could collect on the life insurance policy if the letter-writer committed suicide.
>
> After one of my bookstore appearances, a woman with short gray hair who resembled my mother approached me, her contorted face the embodiment of all those

desperate emails. She had been out of work a year and was out of employment ideas. She was also worried about paying her mortgage the next month.

I ran through my usual spiel about the hidden job market, interim freelance work, networking strategies for job hunters over 50. She spoke slowly, mournfully, shooting down each suggestion, insisting she'd already tried them all.

It worried me that people in such dire straits would tap a stranger they stumbled upon online or in a bookstore for legal, financial, or mental health advice. These were questions to which the only responsible answer was, "You should really talk to a qualified professional about that." It's not that I didn't want to help. It's just that I didn't know how.

"I don't really have anyone to talk to about this," the woman continued, the small bookstore now empty save for the two of us and the event coordinator, who looked to be closing up shop. "I live alone. And nobody cares." The conversation limped along like this for some time, fruitless, hopeless. I suggested a couple sliding scale counseling services and she shot those down, too. I left the bookstore desperate to sleep.

برکسی کا دولت کے پیچھے اندھا دھند بھاگنا غیر فطری ہے اور لوگوں کو اس پر اکسانا قابلِ مذمت۔ میں انسانوں کیلئے صرف ایک بلند کردار اور مسلمہ اخلاقی خوبیوں کے حامل انسان کا آئیڈیل تسلیم کرتا ہوں جس کا حصول دولت کے ساتھ اور اس کے بغیر دونوں طرح ممکن ہے۔

I was starting to feel irresponsible, like the only way I could keep doing this was to forget about all the people my one-size-fits-all platitudes couldn't help. But with coachology comes great responsibility. Responsibility to offer advice you know works, preferably advice you've put to the test yourself. Responsibility to rise above bullshit artistry. Responsibility to not try to solve people's problems you are in no way equipped to fix.

Advising others on how to steer their professional lives and livelihood was a job I no longer wanted. This wasn't just a crisis of skills or cash flow; it was a crisis of conscience.

I'd reached the fork in the road. It was time to make a choice: I could embrace a life of gurudom, assuming a slicker, more polished persona, selling what I knew and faking my way through what I didn't. Or I could return to the quieter, simpler life of a freelance writer. Essentially, I could go Chopra or I could go home.

I chose to go home.

جب معاشی بحران کا آغاز ہوا تو میرے پاس بیماری، بدحالی اور دیوالیے کے شکار افراد کی ای میلز کا تانتا بندھ گیا۔ میرے ایک واقف کار ہم پیشہ نے بتایا کہ اسے ایسے خطوط بھی موصول ہوئے ہیں جن میں لوگوں نے اس سے پوچھا ہے کہ اگر وہ خودکشی کر لیں تو کیا ان کے اہل وعیال ان کی بیمہ پالیسی سے مستفید ہو سکتے ہیں؟ ایک بک سٹور پر ایک تقریب کے بعد میری والدہ سے مشابہ سفید ہوتے بالوں والی معمر خاتون نے مجھے آلیا جن کے چہرے پر گویا مذکورہ بالا ای میلز سے جھلکتے سارے ہی درد نقش تھے۔ وہ ایک سال سے بے روزگار تھیں اور انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ روزگار کیسے حاصل کریں۔ رہن کی

اگلی قسط کی پریشانی انہیں الگ لاحق تھی۔

میں نے فوراً ہی پوشیدہ ملازمتوں، آزادانہ کام اور رابطہ کاری کے ذریعے ملازمت کے حصول کے متعلق اپنی رٹی رٹائی تقریر جھاڑ دی۔ انہوں نے بڑے تاسف کے ساتھ یہ کہہ کر وہ یہ سب کچھ پہلے ہی آزما چکی ہیں میری ساری تجاویز کو رد کر دیا۔

مجھے سخت پریشانی ہونے لگی کہ حالات کے مارے ہوئے لوگوں نے اس طرح اجنبیوں سے راہ چلتے قانونی، معاشی اور نفسیاتی مشورے مانگنے شروع کر دیے تو ان کا کیا بنے گا۔ یہ ایسے سوالات تھے جن کا صرف ایک ہی دیانتدارنہ جواب ہوسکتا تھا کہ مجھے نہیں معلوم، آپ کو کسی ایسے شخص سے پوچھنا چاہیے وہ اس بارے میں واقعی کچھ جانتا ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ میں ان کی مدد کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مجھے واقعی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

بک اسٹور اب خالی ہو چکا تھا اور اس مالک بھی اب جانا چاہتا تھا لیکن خاتون کی گفتگو جاری تھی۔ ”میری باتیں سننے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلی رہتی ہوں اور بظاہر کسی کو میری مجبوریوں کی پرواہ نہیں ہے“۔ ہماری یہ مایوس کن اور بے نتیجہ گفتگو تھوڑی دیر یوں ہی چلتی رہی۔ میں نے کچھ انہیں کچھ کیریئر سروسز کی طرف رجوع کا مشورہ بھی دیا لیکن انہوں نے میری یہ تجویز بھی رد کر دی۔ بک سٹور سے نکلتے وقت میری حالت یہ تھی کہ میں بس ڈھے کر سو جانا چاہتی تھی۔

میرے اندر سے ملامت شروع ہو چکی تھی۔ میں اب ان جیسے سب لوگوں طرف سے آنکھیں موند کر ہی اپنے رٹے رٹائے عمومی مشوروں کا کاروبار جاری رکھ سکتی تھی۔ لیکن کیوں کر؟ مشورہ کار پر بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ بے معنی سخن طرازی کے بجائے ایسے مشورے دے جو واقعی کارآمد ہوں، جن پر اس نے خود بھی عمل کیا ہو نہ کہ بزعمِ خویش لوگوں کے ان مسائل کے حل کیلئے بھی مشورے دیتا پھرے جن کے حل کی اس میں کوئی صلاحیت نہیں ہے۔

میں اب لوگوں کو ان کی عملی زندگی اور روزگار کے متعلق کوئی مشورہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ بات اب مہارت اور آمدن سے آگے نکل چکی تھی اور میں اپنے ہی ضمیر کے کٹہرے میں مجرم بنی کھڑی تھی۔

میرے لیے فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ میں نے فیصلہ کرنا تھا کہ مجھے سیلف ہیلپ گرو کے بھیس میں ایک نوسرباز بن کر سچ اور جھوٹ کے ملغوبے کا کاروبار کرنا ہے یا ایک فری لانسر کی پرانی زندگی کی طرف لوٹنا ہے۔ دوسرے الفاظ مجھے دیپک چوپڑا بننے یا اپنی اصل کی طرف لوٹنے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

میں نے اپنی اصل کی طرف لوٹنے کا فیصلہ کیا۔

مروجہ Success لٹریچر کیوں خطرناک ہے؟

مروجہ Success Literature لٹریچر اس لیے بھی خطرناک ہے کہ یہ ان دو چیزوں کی اہمیت کو کم کرکے دکھاتا ہے جو لوگوں کی زندگی میں واقعی کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہیں یعنی ایک بہتر نظام اور تعلیم۔ انسان کو اکیلا اپنی کامیابی اور ناکامی کا ذمہ دار قرار دے کر ایک بہتر سماجی، معاشی اور قانونی نظام کی اہمیت کا انکار کیا جاتا ہے۔ تاہم جیسا کہ قسمت کے کردار سے متعلق باب میں بڑی تفصیلی بحث اور خصوصاً Bill Gates کے والد

اپنی قسمت کا مالک ہونے کا لغو نظریہ محنت کو ایک اخلاقی قدر کے مقام سے گرا کر محض حصولِ مال کے ایک ٹول کے طور پر پیش کرتا ہے جو اگر مطلوبہ نتائج پیدا نہ کرے تو بیکار ہی سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس قسمت کی حاکمیت کے نظریے پر یقین رکھنے والا محنت کے مثبت یا منفی نتائج سے قطعِ نظر اپنی محنت کے عمل پر فخر اور اس سے خوشی کشید کرسکتا ہے۔

اور دوسرے متمول ترین امریکی Warren Buffet کی گواہیوں سے یہ بات واضح کی گئی ہے، کامیابی میں غالباً سب سے بڑا کردار ایک سازگار ماحول اور نظام کا ہی ہوتا ہے۔

کیا تعلیم بے کار ہے؟

اسی طرح کسی عجیب وغریب جذبے کے تحت موٹیویشنل سپیکرز تعلیم کی اہمیت کو بہت کم کر کے دکھاتے ہیں۔ ان کے ہاں اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ کامیابی کے لیے تعلیم ضروری نہیں ہے اور یہ کہ اکثر کامیاب لوگ یا تو بالکل ان پڑھ ہوتے ہیں یا کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اس بات کو تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کاروبار میں کامیاب ہونے کیلئے تعلیم ضروری نہیں ہے لیکن یہ دعویٰ قطعی طور پر غلط ہے کہ اکثر امیر لوگ کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر 2012ء میں فوربس میگزین نے جن 400 متمول ترین امریکیوں کی فہرست شائع کی ان کی تعلیم کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے صرف پندرہ اعشاریہ آٹھ فیصد ایسے تھے جن کے پاس کالج کی ڈگری نہیں تھی۔ ان پندرہ میں سے نو فیصد نے کالج سے تعلیم چھوڑی۔ گویا صرف 6 اعشاریہ آٹھ فیصد ایسے تھے جنہوں نے صرف میٹرک یا اس سے کم تعلیم حاصل کی۔ گویا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ امیر لوگ اکثر ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف لیبر کی ویب سائٹ پر موجود اعداد و شمار سے بالکل واضح ہے کہ آمدنی اور تعلیم کے درمیان راست تناسب پایا جاتا ہے۔ یعنی جوں جوں تعلیم بڑھتی جاتی ہے آمدنی بھی ساتھ ہی بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ بات صرف امریکہ کیلئے ہی درست نہیں بلکہ پاکستان میں ہونے والی متعدد سٹڈیز سے بھی معلوم ہوا ہے کہ تعلیم اور آمدنی کے درمیان راست تناسب پایا جاتا ہے۔ ایک سٹڈی سے معلوم ہوا ہے کہ تعلیم کا ہر اضافی سال آمدنی میں سات فیصد تک اضافہ کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اور سٹڈی سے معلوم ہوا ہے کہ تعلیم اور غربت کے درمیان بالعکس تناسب پایا جاتا ہے۔ یعنی جوں جوں تعلیم بڑھتی ہے غربت کم ہوتی جاتی ہے۔ تعلیم اور آمدنی کے درمیان تعلق پوری دنیا میں مثبت ہی ہے۔ ہر ملک میں اس تعلق کی طاقت میں تھوڑا بہت فرق تو ہو سکتا ہے مثلاً تعلیم کا

ایک سال ایک ملک میں آمدنی میں سات فیصد اضافہ کرتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ دوسرے میں آٹھ فیصد کرے لیکن یہ تعلق بلا استثناء مثبت ہے۔ اسی وجہ سے عالمی اداروں سے لے کر ہر ملک کی سطح پر پالیسی سازوں کے ہاں اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ تعلیم ترقی کیلیے اولین ترین ترجیحات میں سے ایک ہے۔

کاروبار کی حد تک یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کامیابی کیلئے تعلیم شرط نہیں ہے اگرچہ جیسا کہ اوپر دکھایا گیا ہے موٹیویشنل سپیکرز کے دعووں کے برعکس امیر لوگوں کی اکثریت کم پڑھی لکھی نہیں ہے تاہم کچھ شعبے تو ایسے ہیں جن میں کامیابی کیلئے تعلیم شرط ہے۔ مثال کے طور پر کوئی ان پڑھ سائنسدان نہیں بن سکتا۔ اسی ضمن میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ آئن سٹائن کے بارے میں دیا جانے والا یہ تاثر کہ وہ ان پڑھ یا نالائق تھا بالکل بے بنیاد ہے۔ جس ٹیسٹ میں اس کے فیل ہو جانے کے قصہ زبان زدِ عام ہے اس میں بھی اس نے طبیعات اور ریاضی میں غیر معمولی نمبر حاصل کیے تھے۔ اور 1905ء میں جب اس نے اپنا شہرہ آفاق نظریہ پیش کیا اس وقت وہ اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کر چکا تھا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کو جھوٹے خواب دکھانے کے بجائے انہی دو چیزوں کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ انکی زندگیوں میں کسی حقیقی تبدیلی کا امکان پیدا ہو سکے۔

کیا موٹیویشنل سپیکرز کی مقبولیت ان کے صحیح ہونے کی دلیل ہے؟

ایک دلیل یہ بھی جاتی ہے کہ اگر اتنے سارے لوگ موٹیویشنل سپیکرز کے پاس جاتے ہیں اور بڑی بڑی کمپنیاں بھی ان کو مدعو کرتی ہیں تو کچھ تو فائدہ ہوتا ہی ہوگا ورنہ لوگ کیوں ان کے پاس جائیں یا ان کو اپنے

کسی عادت کے متعلق یہ دعویٰ کہ اس سے کامیابی پیدا ہوتی ہے صرف اس صورت میں کیا جاسکتا ہے جب وہ عادت کامیاب لوگوں میں ہمیشہ پائی جائے اور ناکام لوگوں میں کبھی نہ پائی جائے۔ لیکن ناکام لوگوں کی زندگی کی کہانیوں کو ایسی کوریج ملتی ہی نہیں کہ انکا مطالعہ کیا جاسکے۔

ہاں بلائیں۔ اس دلیل کو درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ کسی چیز کا مشہور یا مقبول ہونا اس کے درست ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ موٹیویشنل سپیکرز کے پاس لوگوں کے ہجوم کی وجوہات کم وبیش وہی ہیں جو جعلی عاملوں اور پیروں کے پاس جمگھٹے کی ہیں۔ برق رفتار اور آسان کامیابی کی خواہش میں لوگ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور باوجود اس کے کہ ان کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہوتا وہ ساری زندگی دھوکہ کھائے رہتے ہیں اور انکی آنکھوں پر عقیدت کی پٹی بندھی رہتی ہے۔ جب کسی کے پاس کچھ لوگ جانا شروع کر دیتے ہیں تو ایک بھیڑ چال شروع ہوجاتی ہے جو مزید لوگوں کو اس طرف مائل کرتی ہے اور اس طرح یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ لیکن جس طرح لوگوں کے جعلی عاملوں، پیروں یا کسی ڈبل شاہ کے پیچھے چل پڑنے سے وہ صحیح ثابت نہیں ہوجاتے اسی طرح موٹیویشنل سپیکرز کے حضور لوگوں کا ازدحام بھی انہیں درست ثابت نہیں کرتا۔ کسی بات یا دعوے کو کسی علمی دلیل سے ہی درست ثابت کیا جاسکتا ہے، لوگوں کی بھیڑ سے نہیں۔

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ چلیے لوگ تو دھوکہ کھا سکتے ہیں لیکن بزنس آرگنائزیشنز تو بے وقوف نہیں ہیں کہ وہ ان لوگوں کو بغیر فائدے کی بھاری معاوضے دے دے کر ان کی خدمات مستعار لیتی ہیں۔ بادی النظر میں یہ اعتراض وزنی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ عام خیال یہی ہے کہ بزنس آرگنائزیشنز پیسے کے معاملے میں بہت ہوشیار ہوتی ہیں اور بلاوجہ کسی کام پر پیسہ ضائع نہیں کرتیں۔ تاہم بزنس اور مینجمنٹ سائنس کا ہر سنجیدہ طالبِ علم یہ جانتا ہے کہ جدید کارپوریٹ دنیا کی تاریخ ہر طرح کے احمقانہ، بے مقصد حتیٰ کہ نقصان دہ مدہائے زود گزر (Fads) سے بھری پڑی ہے۔ اسکی کئی وجوہات ہیں۔ پرفارمینس بڑھانے کی دوڑ میں بڑی کمپنیوں کے ٹریننگ ڈیپارٹمنٹس ہر نئی چیز پر لپکے پڑتے ہیں اور اس کی صحت کا لحاظ کیے بغیر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش شروع کردیتے ہیں اس سے ایک بھیڑ چال شروع ہوجاتی ہے اور دوسری کمپنیاں بھی انہی چیزوں کو اختیار کرنا شروع کردیتی ہیں۔ متعدد سٹڈیز سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ کسی بات کے مشہور ہوجانے کے بعد کمپنیاں اس کو بغیر کسی حقیقی فائدے کے محض Legitimacy کے حصول کیلئے اختیار کرلیتی ہیں (یعنی اگر ایک بڑی کمپنی نے کسی چیز کو اختیار کیا ہے تو چھوٹی کمپنیاں بھی اسے اختیار کرنا شروع کردیتی ہیں تاکہ ان کے

خریدار، انویسٹرز اور میڈیا انہیں بھی جدید اور اچھی کمپنیاں سمجھیں)۔اسی طرح عام طور پر جب لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک کمپنی اپنے ملازمین کو بہت ساری ٹریننگز کرواتی ہے اور وہ کامیاب ہے تو وہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں ان کا کامیابی کی وجہ یہ ٹریننگز ہیں۔ درآنحالیکہ زیادہ ممکن یہ ہے کہ چونکہ یہ کمپنیاں کامیاب ہیں اور ان کے پاس پیسہ ہے لہذا وہ یہ ٹریننگز کرواتی ہیں۔ان ساری باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ افراد اور کمپنیوں میں موٹیویشنل سپیکرز کی مقبولیت ان کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

موٹیویشنل سپیکرز کی مقبولیت اور سرمایہ دارانہ نظام

محترم شاہد اعوان صاحب نے موٹیویشنل سپیکرز کی مقبولیت کی ایک اور وجہ اور اس کے ممکنہ نتائج کو بڑی خوبصورتی سے واضح کرتے ہوئے "نام نہاد Motivational Speakers اور مثبت سوچ کے منجن کی فروخت" کے زیرِ عنوان لکھا ہے:

> سرمایہ دارانہ نظام نے جدید انسان سے ہر وہ چیز چھین لی ہے جو کبھی اسکے لئے باعث شرف ہوتی تھی۔ انسانی روح کو ایسے اندھے کنویں میں دھکیل دیا ہے جہاں خود اسے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوتی ہے۔اس نظام میں ہر انسان ایک "صارف" ہوتا ہے اور بس۔ انسان کی ہر صلاحیت، فن، Skill اور علم اگر سرمایہ کی بڑھوتری کے لئے استعمال ہو تو اسکا "فائدہ" ہے ورنہ "بے کار"۔ بولنے اور گفتگو کا فن بھی جب تک انسانوں کو "صارف" بنانے کے لئے استعمال نہ ہو اسے "مفید" تصور نہیں کیا جاتا۔ نام نہاد Motivational Speakers اس افادی نقطہ نظر کی عمدہ مثال ہیں۔
>
> گفتگو کا فن، خطابت اور ابلاغی صلاحیت کبھی قابل قدر اثاثہ ہوتا تھا مگر ان نام نہاد Trainers نے اسے ایک قابل فروخت جنس میں تبدیل کر کے ظلم کیا ہے۔ بڑبولا پن، جو کبھی خصائل رذیلہ میں شمار ہوتا تھا اب انکے ہاں ایک کاروباری جنس تصور ہوتی ہے جو ہر

صورت مالی یافت کا ذریعہ ہونی چاہئے۔

یہ جدید جہلا، دراصل Corporate Culture کے وہ آلے (Tools) ہیں جو زبانِ غیر کے منہ زور گھوڑے پہ سوار، مانگے کے افکار بے مایہ کو "مایہ" کے لئے سونا بنا کر پیش کرتے ہیں اور اپنے ہی ہم وطنوں کو مرعوب کر کے تالیاں پٹواتے ہیں۔ گاہے، جعلی اور فرضی تحقیق کے حوالے اور تیسرے درجہ کے لکھاریوں کے ادھ کچرے خیالات کی جگالی، نفس مضمون کے بجائے بدن بولی، متاثر کن حلیہ اور سامعین کی نفسیات سے کھیلنے کی جادوگرانہ تراکیب ان کا کل اثاثہ ہوتی ہیں۔ علمی افلاس کے مارے، سادہ اور عام پڑھے لکھے عوام کی تحسینِ ناشناس کے بل پر یہ حضرات بازار میں اپنی وقعت بڑھانے کی نامحمود کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

"مثبت سوچ" کا منجن بیچنا خود ان اسپیکرز اور ٹرینرز کے حق میں تو بہت "مثبت اور کارآمد" ثابت ہوتا ہے مگر سامعین کو ایک فوری --- یا اکثر تاخیری --- ڈپریشن، Guilt، غیر حقیقی آدرش کے منفی اثرات کا شکار کر چھوڑتا ہے۔

حاصل بحث

اس مرحلے پر، پچھلے ابواب میں کی جانے والی بحث کا خلاصہ کرنے اور زیادہ جامع انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مروجہ Success Literature اور اس کے مبلغین کے خلاف میرے مقدمے اور متبادل نظریے کے خدوخال مزید واضح ہو سکیں۔

وہ تصورِ کامیابی جس کا پرچار بالعموم پیشہ ور مقررین و مصنفین بلواسطہ یا بلاواسطہ کرتے ہیں اس میں دولت و شہرت ہی کامیابی کے بنیادی پیمانے ہیں۔ یہ تصورِ کامیابی مجموعی مذہبی و اخلاقی روایت اور فطرتِ انسانی کے تنوع کی نفی پر قائم ہے جس کے نتائج خطرناک ہیں۔ اور اس میں روحانیت شامل کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ نہایت بھونڈی اور ناقص ہیں جن سے اسکی بدصورتی میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ مذہبی و اخلاقی تعلیمات و رسومات کو دولت و شہرت کے حصول کے ٹولز کے طور پر دیکھنے کی روش سے نہ دولت و شہرت حاصل ہوتی ہیں اور نہ انسان کی روحانی فلاح کا مقصد۔ اخلاقی و مذہبی اصولوں کے اختیار سے حقیقی روحانی فلاح صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ان کو باقی ہر چیز سے برتر و مقدم مان کر اختیار کیا جائے۔

میں بالاصرار یہ عرض کروں گا کہ میں کسی راہبانہ نظریے کا پرچار نہیں کر رہا۔ میں خوش حالی کے حصول کی کوشش کو ہر کسی کیلئے جائز سمجھتا ہوں تاہم میں اسے ہر کسی کیلئے لازمی قرار دینے پر تیار نہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ کچھ لوگوں کیلئے کاروبار میں کمال حاصل کرنے کی خواہش بالکل اسی طرح فطری ہے جس طرح کچھ لوگوں کیلئے علمِ دین میں کمال پیدا کرنے کی۔ تاہم ہر کسی کا دولت کے پیچھے اندھا دھند بھاگنا غیر فطری ہے اور لوگوں کو اس پر اکسانا قابل مذمت۔ میں انسانوں کیلئے صرف ایک بلند کردار اور مسلمہ اخلاقی خوبیوں

کے حامل انسان کا آئیڈیل تسلیم کرتا ہوں (جس کا حصول دولت کے ساتھ اور اس کے بغیر دونوں طرح ممکن ہے) اور دولت کو عزت کا معیار ماننے پر تیار نہیں ہوں۔

دولت و شہرت کا انحصار ان عوامل پر ہے جو انسان کے بس سے باہر ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے قسمت کہیں، خدا کی مرضی یا محض اتفاق۔ یہ نظریہ احمقانہ ہے کہ انسان اپنی قسمت کا بایں معنیٰ مالک ہے کہ اسکی امارت و غربت کی ذمہ داری صرف اور صرف اسی پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے حق میں نہ کوئی علمی دلیل ہے نہ مذہبی۔ مذہب، عقل اور تحقیق اس کی نفی کرتے ہیں اور اس پر یقین رکھنا امیر، غریب اور معاشرے سب کیلئے تباہ کن ہے۔ یہ نظریہ امیر کو گھمنڈی و خودغرض بناتا اور غریب کو اپنی ہی نظر میں گراتا ہے۔

مثبت خیالات کی کرشماتی طاقتیں محض افسانہ ہیں اور رجائیت پر بے جا اصرار نقصان دہ۔ منفی جذبات اور سوچوں کا ایک خاص حد تک وجود اسی طرح ضروری ہے جس طرح مثبت خیالات و جذبات کا۔ اسی طرح کامیابی کے تمام نام نہاد عمومی اصول اور ٹوٹکے بے کار اور لایعنی ہیں۔ محض کچھ عادات اپنا کر کوئی امیر نہیں ہوتا نہ ہی انکو ترک کرنے سے غریب ہوتا ہے۔ اس طرح کی چیزوں کا پرچار لوگوں کو کوئی فائدہ دینے کے بجائے انہیں الجھن اور ڈپریشن کا شکار کر رہا ہے۔

اپنی امارت و غربت، کامیابی اور ناکامی کی ساری ذمہ داری افراد پر ڈالنے اور افراد کیلئے کامیابی کے نسخے تیار کرنے کے بجائے میں ایک عادلانہ معاشرے کے قیام کو مجموعی فلاح کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ تعلیم، اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ایک مناسب درجے کی خوشحالی اور عدل وہ ذرائع ہیں جو افراد کی صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر معاشرے کی مجموعی بہتری کا باعث بن سکتے ہیں۔ تاہم عادلانہ سے عادلانہ معاشرے میں بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ ہر فرد کامیاب ہوگا۔ انفرادی کامیابی کا انحصار پھر بھی قسمت پر ہوگا۔

قسمت کی حاکمیت کے نظریے پر یقین رکھنے سے بدعملی اور ترکِ محنت لازم نہیں آتے۔ محنت کا جذبہ انسان کی فطرت کے اندر ودیعت شدہ ہے اور محنت کو تاریخی طور پر ایک اخلاقی قدر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

اپنی قسمت کا مالک ہونے کا لغو نظریہ محنت کو ایک اخلاقی قدر کے مقام سے گرا کر محض حصولِ مال کے ایک ٹول کے طور پر پیش کرتا ہے جو اگر مطلوبہ نتائج پیدا نہ کرے تو بیکار ہی سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس قسمت کی حاکمیت کے نظریے پر یقین رکھنے والا محنت کے مثبت یا منفی نتائج سے قطعِ نظر اپنی محنت کے عمل پر فخر اور اس سے خوشی کشید کر سکتا ہے۔

کامیابی کا جدید معبد اور آدمیت پہ اصرار

احمد جاوید

سرمایہ داری نظام میں کامیابی اور ناکامی کے تصورات کو جس طرح انسان کے اخلاقی آدرشوں سے لاتعلق کیا گیا ہے اس سے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دنیا کو اصطبل بنایا جا رہا ہے جہاں گھوڑوں کو یہ باور کروایا جائے گا کہ تم انسان کی ارتقاء یافتہ شکل ہو۔

کامیابی کے گُر بتانے والے کرتب بازوں کی پوری کھیپ دراصل اسی نوعی ارتقاء کی راہ ہموار کرنے میں جتی ہوئی ہے اور ہمیں اپنے اگلے ارتقائی مراحل سے پیشگی مانوس کر رہی ہے۔ یہ لوگ انسانیت سے رضا کارانہ دستبرداری کو ایک مقدس مشن بنا کر ہمیں ریس کا گھوڑا بننے پر آمادہ کرنے نکلے ہیں۔

مجھے عاطف صاحب کی یہ تحریر دیکھ کر اس پہلو سے بھی ایک اطمینان میسر آیا کہ ابھی کچھ لوگ ہیں جنہیں اپنی آدمیت پر اصرار ہے۔ اور وہ کامیابی کے اس جدید معبد میں پوجا کے واسطے نہیں بلکہ بت شکنی کیلئے داخل ہوئے ہیں۔ قابلِ اعتماد ریسرچ، لائق رشک تنقیدی بصیرت، معروضی تجزیہ اور اچھی نثر اس کتاب کی خصوصیات ہیں۔ اور یہ بھی کہ غالباً اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کاوش ہے۔

جدوجہد: اصل کامیابی

عاصم اللہ بخش

انسان کا نفسیاتی جائزہ یہ بتاتا ہے کہ وہ ہمہ وقت جسمانی راحت اور روحانی اطمینان کا خواہاں و متلاشی رہتا ہے۔ زندگی کی جدوجہد کے ہنگام کوئی ایسا آمیزہ جو ان دونوں کے حوالے سے کسی درجہ کفایت کر دے کامیابی کہلاتا ہے۔ یہ آمیزہ جس قدر گاڑھا ہوتا چلا جائے گا انسان خود کو اتنا ہی زیادہ کامیاب سمجھے گا۔ اسی کو Self Actualization بھی کہا گیا یعنی انسان نے تکمیلِ ذات کے مدارج کو کس قدر طے کر لیا۔

تاریخی تناظر میں یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ اگرچہ روحانی سرشاری انسان کی ذہنی اور جسمانی بالیدگی کی بنیاد ہے لیکن ظواہر کی اس دنیا میں بسا اوقات وہ ظاہری اہداف کے حصول کے لیے روح (اسے ہم اندر کا بھلا مانس بھی کہہ سکتے ہیں) کے تقاضوں سے یکسر اعراض کی روش بھی اپنا لیتا ہے۔ کیا ایسی غیر متوازن پیشرفت محض اپنی ظاہری چمک دمک کے بل بوتے پر "کامیابی" کہلانے کے لائق ہے، اس پر بہر صورت دو آراء ممکن ہیں۔ تاہم اپنی چکا چوند کے باعث اس کی اثر پذیری اور عامۃ الناس میں اس کی طلب سے انکار ممکن نہیں۔

کامیابی کی اس طلب اور اس طلب والے لوگوں کی معاشی سسٹم کو ضرورت کے تحت بیسویں صدی میں کچھ ایسی اسٹڈیز کی گئیں جن کا محور کچھ Behavior Patterns کو شارٹ لسٹ کرنا تھا جنہیں کامیابی کے حصول کی کلید قرار دیا جا سکے۔ نتیجتاً ہمیں ایسی کتابیں، لیکچرز اور ورکشاپس دیکھنے کو ملیں جہاں کچھ رویوں کی خاص درجہ کی یکسانیت کو کامیاب لوگوں کا عنصرِ ترکیبی قرار دیا گیا اور ان کی بنیاد پر Standardized

Behavioral Approaches کی داغ بیل ڈالی گئی۔

یہ اس طرح کی پہلی یا واحد کاوش نہیں۔

مذہب اس عمل کا پہلا داعی رہا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اس کا نکتہ ارتکاز ظاہر پر ہے تو سہی لیکن باطن پر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس کا فوکس اپنا باطن بہتر کرنے پر ہے اور دوسروں کا ظاہر۔ یہاں دوسروں کے ظاہر کی بہتری سے مراد رسومات کے نام پر مذہبی جبر نہیں بلکہ زندگی کے چیلنجز کے مقابل ان کے لیے آسانی پیدا کرنا ہے۔

غیر مذہبی حوالوں میں افلاطون کے ہاں ہمیں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ مختلف پیشوں سے وابستہ لوگوں میں اس پیشے میں یدطولیٰ رکھنے کے لیے کچھ خاص صفات ایسی ہونا لازم ہوں جو ان کو ممتاز کر سکیں۔ اس سلسلہ میں اس نے معرکۃ الآراء کتاب "ریپبلک" میں خاصے سیر حاصل مباحث کیے ہیں۔

جہاں کسی بھی ایسی تکنیک کی افادیت سے انکار ممکن نہیں جو فرد کو آگے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہو وہیں یہ بات بھی اہم ہے کہ افراد کی انفرادی خصوصیات کے باہم تفاوت کو بھی مدنظر رکھا جائے تاکہ کامیابی کے امکان سے متعلق غیر حقیقی توقعات جنم نہ لیں۔ یہ باور کرانا اہم ہے کہ کوشش کی کیفیت میں خوبی انسان کو بہتر ضرور کرتی ہیں لیکن بہترین ہونے کے لیے محنت اور تکنیک کے علاوہ بھی بہت کچھ درکار ہے، مثلاً۔۔۔ مواقع، مقابلہ اور حالات۔ آپ اس مجموعہ کو قسمت بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس امر کا درست اندازہ لگانے کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ اپنے حوالوں میں جن Icons کی مثالیں ان ورکشاپس میں دی جاتی ہیں وہ معاشرے میں کیا تناسب رکھتے ہیں۔ دنیا میں کتنے وارن بوفے ہیں، چارلی چیپلن ہیں یا پھر ابراہام لنکن ہیں۔

اگر Reality Check کی بات کی جائے تو حقیقی کامیابی انسان کے ظاہر و باطن دونوں کے حوالہ سے ہی ہوسکتی ہے ورنہ "سیلف ایکچوالائزیشن" کا ہدف تشنہ تکمیل رہ جائے گا۔ کامیابی کی لگن اور اس کے حصول کے

طریقے درحقیقت منزل تک رسائی کو یقینی نہیں بناتے البتہ جدوجہد کے پیرایہ کو یقیناً سنوار دیتے ہیں۔ یہ کچھ کم بڑی بات نہیں کیونکہ انسانوں کی غالب اکثریت تو اسی راہ کی مسافر ہے۔

زبان سے خندق پار کرنے والے

حسنین جمال

یہ اور بات ہے ہم منہ سے کچھ نہیں کہتے

ہر ایک بات کی لیکن ہمیں خبر ہے میاں

سریش چند شوق جی مرحوم کا یہ شعر کچھ یوں یاد آیا کہ آج کل ایک سرگرمی ہمارے معاشرے میں کافی زیادہ دکھائی دینے لگی ہے اور معاملہ جو ہے وہ "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" والا ہے تو سوچا اس پر بات ہو جائے۔ایک محاورہ یہ بھی سنا تھا "زبان سے خندق پار کرنا"، یعنی شیخی بگھارنا اور قوت گفتار سے خواب و خیال میں ناممکن کو ممکن کر دکھانا وغیرہ، لیکن جب ہم بڑے ہوئے تو کچھ ایسے مہربان ملے جو واقعی زبان سے خندق پار کرا دیتے ہیں۔

آپ اگر کہیں کالج وغیرہ میں پڑھتے ہیں تو اچانک ایک دن اعلان ہوگا کہ بھئی فلاں دن اتنے بجے "ط ظ" صاحب آئیں گے اور آپ کو مستقبل کامیاب بنانے کے گر بتائیں گے۔یا پھر اسی طرح سے کچھ اور ایسا بتایا جائے گا جسے سن کر آپ کے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑ جائے گی۔اگر آپ کسی دفتر میں کام کرتے ہیں تو بھی کوئی نہ کوئی ایسا مژدہ اچانک آپ کے دروازے پر دستک دے گا اور آپ سنیں گے کہ بھئی آئندہ ہفتے فلاں صاحب دفتری ٹینشن کم کرنے کے طریقے بتائیں گے۔

اگر آپ کسی کمپنی میں مارکیٹنگ یا سیلز سے وابستہ ہیں تو پھر آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔خاص طور سے

بیمہ کمپنی والے بھائی صاحبان، کیوں کہ اس کام کا تو مکمل دارومدار ہی جذبے کی شدت پر ہے۔ کاغذ بیچنا اس دنیا کا سب سے بڑا فن ہے، اور وہ کاغذ کا ٹکڑہ بیچ دینا کہ جس کا منافع آپ کو مرنے کے بعد ملے گا، واقعی کمال فن ہے۔ فقیر خود بیمہ شدہ ہے، افادیت سے بھی انکار نہیں مگر چوں کہ اس کوچے میں بھی کچھ عرصہ گزارا ہے تو یہ جانتا ہے کہ کاغذ ہو یا کچھ بھی، کسی دوسرے شخص کو بیچنا ایک باقاعدہ فن ہے اور اس فن میں اہم ترین چیز آپ کا Motivational Level ہوتا ہے۔ تو اس لیول کو اس درجے پر پہنچانے کے واسطے، کہ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے، ایک نیا کام شروع ہوا ہے جسے Motivational Speaking کہا جاتا ہے۔

آپ وہ گانا سنتے ہوں گے، ہے جذبہ جنون تو ہمت نہ ہار، شاید یہ ورلڈ کپ کے دوران بھی بہت چلا تھا۔ تو یہ گانا کیا تھا، یہ آپ کے جذبات کے لیے مہمیز ہوتا تھا اور آپ کو ایک شدت کے ساتھ جیت حاصل کرنے پر اکساتا تھا۔ وہی کام ہمارے ماہرین موٹیویشن کا ہوتا ہے۔ آپ ان کی ورکشاپ میں خوب نک سک سے تیار ہو کر جاتے ہیں کہ بھئی کچھ سیکھ کر آئیں گے، جب تک وہ لیکچر چل رہا ہوتا ہے آپ ساتویں آسمان پر ہوتے ہیں اور آپ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ یار ہم تو نرے گھامڑ تھے، یعنی یہ سیلز یا مارکیٹنگ وغیرہ اتنے آسان کام ہیں اور ہم نے انہیں خواہ مخواہ اعصاب پر سوار کیا ہوا تھا۔ وہ صاحب آپ کو بتاتے ہیں کہ کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ آپ یہ سوچ لیں کہ آپ نے ناکام ہونا ہی نہیں، آخری دم تک لڑنا ہے، اور آپ دیکھیں گے کہ جیت آپ ہی کی ہوگی۔ یا پھر وہ آپ سے کہیں گے کہ کامیابی صرف دماغ کا کھیل ہے، اگر آپ نے سوچ لیا کہ آپ کامیاب ہوں گے، تو آپ صرف کامیاب ہی ہوں گے اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ اگر کسی چیز کی آرزو پورے جذبے کے ساتھ کریں اور تن من دھن کے ساتھ اسے حاصل کرنے میں لگ جائیں تو پوری کائنات آپ کے ساتھ ہو جاتی ہے اور جیت آپ ہی کی ہوتی ہے۔ پھر آپ یہ سنیں گے کہ یہ جتنے بڑے بڑے امیر یا کامیاب لوگ ہیں یہ کچھ خاص پڑھے لکھے نہیں تھے۔ یا

بچپن میں سکول سے بھاگ جاتے تھے، یا کالج میں فیل ہوتے تھے، یا انتہائی غریب تھے اور اپنے زور بازو کے دم پر انہوں نے سات آسمان چھو لیے اور دھرتی ہلا دی، تباہی مچا دی، کامیابیوں کی نئی مثال قائم کر دی وغیرہ۔

اس سب کے بیچ میں آپ سے طرح طرح کے کھیل کھلوائے جائیں گے جنہیں Mind Refreshing Games کہا جاتا ہے۔ اور یہ گیمز واقعی اس طریقے سے بنائی جاتی ہیں کہ اگر آپ ورک شاپ کے دوران تھک گئے ہوں یا نیند آنے لگے تو یہ سب کچھ بھگا دیتی ہیں اور آپ دوبارہ ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں۔ تو آپ پانچ دس منٹ کے وقفے میں کھیل کود کر دوبارہ آ کر بیٹھیں گے، پھر آپ کو مختصر سی کوئی Motivational Movie دکھائی جائے گی۔ عموماً کوئی Physically Challenged صاحب ہوں گے، جو باوجود کسی بھی قسم کی جسمانی کمی کے، اپنے روز مرہ کے معاملات کامیابی سے چلا رہے ہوں گے یا کوئی اور صاحب ہوں گے جو بتائیں گے کہ ایک حادثے نے ان کی زندگی کس طرح بدل دی اور آپ بے اختیار شکر کر اٹھیں گے کہ یا مرے مولا، تیری مہربانی، میں تو مکمل صحت مند ہوں اور پھر بھی ہڈ حرامی کرتا ہوں اور یہ بے چارے جن کو اتنی پریشانی ہے یہ کیسے سب کچھ اتنی کامیابی سے کر رہے ہیں، کل سے میں اور زیادہ محنت کروں گا اور کامیابی حاصل کر کے رہوں گا۔

پھر اکثریت ان سپیکرز میں ان لوگوں کی ہوتی ہے جو ساتھ ساتھ مذہب کا تڑکا بھی ٹریننگ میں لگاتے ہیں۔ آپ کو کسی بزرگ کے واقعات سنائیں گے، کوئی چھوٹا موٹا وظیفہ بھی بتایا جائے گا، لگے ہاتھوں ایک آدھ نماز بھی آپ کو ساتھ پڑھائیں گے اور اس میں بھی آپ کی کامیابی کی دعا مانگی جائے گی۔ اور یوں بات موٹیویشنل معاملات شروع ہو کر دعا کی افادیت پر آن ٹھیرے گی لیکن آپ اتنے Charged ہوں گے اور آپ کے اندر اتنی مثبت قوت بھر چکی ہو گی کہ آپ اس بارہ مصالحے والی چاٹ کا صحیح سے تجزیہ بھی نہیں کر پائیں گے۔

پھر آخر میں آپ کو مختلف کامیاب لوگوں کی کتابوں کے حوالے دیئے جائیں گے اور چن چن کر وہ صفحات بتائے جائیں گے جن کے بعد کامیابی حاصل کرنے کا سات آٹھ Steps پر مشتمل نسخہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ میں اتنی ہوا بھر چکی ہوگی کہ اگر آپ ایک غبارے ہوتے تو یقیناً پھٹ جاتے۔ اور پھر بقول شاعر، یوں نیک نچھتر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم!

لیکن چوں کہ آپ ایک انسان ہیں تو اس لیے آپ پھٹتے نہیں لیکن ایک ہفتے بعد دل پھٹ جاتا ہے آپ کا۔ آپ شدید مایوسی کے عالم میں ہوتے ہیں۔ اس ورکشاپ میں سیکھی گئی باتوں میں سے کوئی بھی آپ کے کام نہیں آ رہی ہوتی اور تلخ زمینی حقائق آپ کو گھیرے میں لیے جھینگا لا لا ہو قسم کا رقص کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ دوسرے ساتھیوں سے پوچھتے ہیں تو وہاں بھی یہی سین ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جہاں سے چلے تھے وہیں کھڑے ہیں بلکہ گڑے ہیں، کچھ بھی پیش رفت نہیں ہوئی، سوائے اس کے کہ ورکشاپ میں گزارے گئے چند گھنٹے اچھے گزر گئے، موج میلہ ہو گیا، لیکن کوئی کل سیدھی نہیں بیٹھی، سب حالات ویسے ہی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

یوں ہے کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے دنیا کے چند دیگر معاملات بھی موجود ہوتے ہیں، پہلے اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً، اگر ٹاٹا اور برلا کامیاب ہیں تو اس کے پیچھے ان کی اپنی خاندانی دولت تھی جسے انتہائی کامیابی سے انہوں نے ضرب دے لی اور کامیاب ٹھیرے۔ مارک زوکر برگ نے فیس بک بنائی تو یہ ایک اتفاق تھا کہ وہ اپنے انٹرفیس کی وجہ سے اتنی مشہور ہو گئی کہ آج وہ دنیا کے امیر ترین کاروباری لوگوں میں سے ہیں۔ ان کے پیچھے ان کے ملک کا ایک پورا سسٹم تھا، اگر وہ کسی ایشیائی ملک میں بیٹھ کر کسی معمولی سے کالج میں یہ کام کرتے تو کیا یہ ممکن تھا، شاید نہیں۔ ڈرامہ سیریل وارث اتنا کامیاب تھا کہ گلیاں سنسان ہو جاتیں اور لوگ اسے دیکھنے جگہ جگہ اکٹھے ہو جاتے، اس کے فن کار بھی اسی لحاظ سے کامیاب ہوئے لیکن آج کیا یہ ممکن ہے کہ سو سے زیادہ تعداد میں چینلز ہوتے ہوئے کوئی ڈرامہ ایسی کامیابی حاصل کر لے، ناممکن ہی نہیں

بعید از قیاس ہے۔ میر باقر علی داستان کہتے تھے، مشہور زمانہ تھے، زمانہ ہی بدل گیا، داستانیں سننے والوں کی زندگیاں مصروف ہونے لگیں تو رش کم ہوتا گیا اور آخر میر صاحب بے چارے چل چلاؤ کی عمر میں چھالیہ بیچنے کو مجبور ہوئے۔

انضمام الحق کڑی مصری خان ملتان میں رہتے تھے، اچھا کرکٹ کھیلتے تھے، ٹرائل دیئے سلیکٹ ہو گئے۔ لیکن ان کے ساتھ کئی اور لڑکے بھی بہت عمدہ کھیلتے تھے، انہوں نے بھی ٹرائل دیئے، کوئی کسی ٹیکنکل غلطی سے رہ گیا کوئی وقت پر نہ پہنچ پایا، کوئی اچھا کھیل ہی نہ دکھا پایا، آپ ان میں سے کسی کا نام جانتے ہیں؟ تو کیا انضمام کی سلیکشن میں وقت اور اتفاقات کی خوبی شامل نہیں تھی؟ یا وہ بھی گھر سے کامیاب ہونے کا دیوانہ وار عزم کر کے اور منت مان کر نکلے تھے؟

ان کے علاوہ بے شمار واقعات ہیں۔ آپ کسی بھی کامیاب شخص کی زندگی کا مطالعہ کیجیے، آپ کو پیچھے کوئی سسٹم یا اتفاقات کا کوئی ایک سلسلہ نظر آئے گا، ٹھیک ہے، محنت بھی ہوگی لیکن محنت تو سب کرتے ہیں مگر ہر ایک کو صلہ کب ملتا ہے۔

اور پھر آخری لیکن سب سے اہم بات یہ کہ آپ کامیابی کی تعریف کیا کرتے ہیں؟

دیکھیے، وحشیانہ طور سے محنت کر کے چار پیسے کما لینا اور معاشرتی مقام کچھ بہتر کر لینا بے شک کامیابی ہے لیکن ایسی بھی کیا کامیابی کہ گھر والے آپ کی صورت کو ترس جائیں، بچوں کو آپ سوتا چھوڑ کر جائیں اور سوتوں کو ہی آن کر پیار کر لیں تو یہ کیا زندگی ہوئی۔

توقعات کچھ محدود کر لیں تو بہت اچھی بسر ہو سکتی ہے۔ خاور، ہمارے برادر خورد کا قول ہے کہ "کھل کر برا سوچیں، جتنا مرضی برا سوچیں، ہوگا وہی جو ہونا ہے، اچھا سوچنے سے الٹا کچھ نہ کچھ مایوسی ضرور ہوگی اگر انجام اچھا نہ ہوا۔ برا سوچیں گے تو ناکام ہونے پر کم از کم مایوسی نہیں ہوگی کہ بھئی یہ تو ہمیں پہلے ہی معلوم تھا، چلو جو ہوا سو ہوا اب آگے کی راہ دیکھتے ہیں۔" Motivational Speakers کی بات تو یاد رکھیے؛ وہ جتنی

بھی مثالیں دیتے ہیں کہ فلاں آدمی بچپن میں فیل ہوا، فلاں کے ساتھ یہ ہوا، وہ ہوا، ان کو کراس چیک کر لیجیے، ان میں کی اکثر غلط نکلیں گی۔

کامیابی دماغ سے یا پاگلوں کی طرح بھاگنے سے حاصل نہیں ہوتی، اس کے لیے بقول گوروں کے، ایک Lucky Stroke of Fortune کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

یہ سپیکر بھائی چونکہ باتوں کی کمائی کھاتے ہیں اور نام خدا اچھے خاصے خوش حال بھی ہوتے ہیں تو اس بات سے متاثر مت ہوں کہ ان کی کامیابی کا گر ہی یہ ہے کہ وہ زبان سے خندق پار کرانے کے ماہر ہوتے ہیں۔۔اگر آپ اچھے طریقے سے بات کر سکتے ہیں تو آپ بھی ایک اچھے سپیکر تو بن سکتے ہیں مگر کاروبار میں یا نوکری میں کامیابی چیزے دیگر است!

اور سب سے آخری بات یہ کہ ناکام آدمیوں کی سوانح کبھی لکھی نہیں جاتی، وہ لکھی جائے تو آپ دیکھیے کہ لوگ ساری عمر محنت کر کے بھی وہ کچھ حاصل نہ کر پائے جو آج آپ کے پاس موجود ہے۔

حوالہ جات:

Abuya, B. A., Ciera, J., & Kimani-Murage, E. (2012). Effect of mother's education on child's nutritional status in the slums of Nairobi. BMC pediatrics, 12(1), 80.

Adair, L. S., Fall, C. H., Osmond, C., Stein, A. D., Martorell, R., Ramirez-Zea, M., ...& Victora, C. G. (2013). Associations of linear growth and relative weight gain during early life with adult health and human capital in countries of low and middle income: findings from five birth cohort studies. The Lancet, 382(9891), 525-534.

Aturupane, H., Glewwe, P., & Wisniewski, S. (2013). The impact of school quality, socioeconomic factors, and child health on students' academic performance: evidence from Sri Lankan primary schools. Education Economics, 21(1), 2-37.

Avan, B. I., & Kirkwood, B. (2010). Role of neighbourhoods in child growth and development: Does 'place'matter?.Social science & medicine, 71(1), 102-109.

Awan, M. S., Malik, N., Sarwar, H., & Waqas, M. (2011). Impact of education on poverty reduction.

Barreca, A. I. (2010). The long-term economic impact of in utero and postnatal exposure to malaria. Journal of Human Resources, 45(4), 865-892.

Bennell, P. (1996). Rates of return to education: Does the conventional pattern prevail in sub-Saharan Africa?.World development, 24(1), 183-199.

Breierova, L., & Duflo, E. (2004). The impact of education on fertility and child mortality: Do fathers really matter less than mothers? (No. w10513). National Bureau of Economic Research.

Byrne, R. (2006). The secret. Simon and Schuster.

Casale, D., Desmond, C., & Richter, L. (2014). The association between stunting and psychosocial development among preschool children: a study using the South African Birth to Twenty cohort data. Child: care, health and development, 40(6), 900-910.

Case, A., Fertig, A., & Paxson, C. (2005). The lasting impact of childhood health and circumstance. Journal of health economics, 24(2), 365-389.

Chen, Y., & Li, H. (2009). Mother's education and child health: Is there a nurturing effect?.Journal of Health Economics, 28(2), 413-426.

Covey, S. R. THE SEVEN HABITS OF HIGHLY EFFECTIVE PEOPLE.

Currie, J. (2008). Healthy, wealthy, and wise: Socioeconomic status, poor health in childhood, and human capital development (No. w13987). National Bureau of Economic Research.

Currie, J., Stabile, M., Manivong, P., & Roos, L. L. (2010). Child health and young adult outcomes. Journal of Human Resources, 45(3), 517-548.

Davis-Kean, P. E. (2005). The influence of parent education and family income on child achievement: the indirect role of parental expectations and the home environment. Journal of family psychology, 19(2), 294.

Desai, S., & Alva, S. (1998). Maternal education and child health: Is there a strong causal relationship?.Demography, 35(1), 71-81.

Dobelli, R. (2013). The art of thinking clearly. HarperBusiness.

Dwumoh, D., Essuman, E. E., & Afagbedzi, S. K. (2014). Determinant of factors associated with child health outcomes and service utilization in Ghana: multiple indicator cluster survey conducted in 2011. Archives of Public Health, 72(1), 42.

Ethanbeute (January 2012). Education Levels of the Forbes 400 Richest Americans. Ethan Beute. Retireved from http://ethanbeute.com/forbes-400-rich-american-education-level-college-dropout/ on December 22, 2015.

Felton, J., Gibson, B., & Sanbonmatsu, D. M. (2003). Preference for risk in investing as a function of trait optimism and gender. The journal of behavioral finance, 4(1), 33-40.

Forgas, J. P. (2007). When sad is better than happy: Negative affect can improve the quality and effectiveness of persuasive messages and social influence strategies. Journal of experimental social psychology, 43(4), 513-528.

Forsey, C. A. (2015). How to become an advice guru: the new age spirit of entrepreneurial selfhood.

Forgas, J. P. (2013). Don't worry, be sad! On the cognitive, motivational, and interpersonal benefits of negative mood. Current Directions in Psychological Science, 22(3), 225-232.

Fotso, J. C. (2007). Urban–rural differentials in child malnutrition: trends and socioeconomic correlates in sub-Saharan Africa. Health & Place, 13(1), 205-223.

Frost, M. B., Forste, R., & Haas, D. W. (2005). Maternal education and child nutritional status in Bolivia: finding the links. Social science & medicine, 60(2), 395-407.

Gabbay, T. (September, 2011). Elizabeth Warren on class warfare: 'There is nobody in this country who got rich on his own. TheBlaze. Retrieved from http://www.theblaze.com/stories/2011/09/21/elizabeth-warren-on-class-warfare-there-is-nobody-in-this-country-who-got-rich-on-his-own/on December 22, 2015.

Gao, W., & Smyth, R. (2010). Health human capital, height and wages in China. The Journal of Development Studies, 46(3), 466-484.

Gibson, B., & Sanbonmatsu, D. M. (2004). Optimism, pessimism, and gambling: The downside of optimism. Personality and Social Psychology Bulletin, 30(2), 149-160.

Goodman, M. Confessions of a failed self-help guru. Retrieved from http://narrative.ly/confessions-of-a-failed-self-help-guru/?utm_source=Narratively+email+list&utm_campaign=c3f6bd7514-March_103_10_2016&utm_medium=email&utm_term=0_f944cd8d3b-c3f6bd7514-66350937 on March 13, 2016.

Gruber, J., Mauss, I. B., & Tamir, M. (2011). A dark side of happiness? How, when, and why happiness is not always good. Perspectives on Psychological Science, 6(3), 222-233.

Kahneman, D. (2011). Thinking, fast and slow. Macmillan.

Kappes, H. B., & Oettingen, G. (2011). Positive fantasies about idealized futures sap energy. Journal of Experimental Social Psychology, 47(4), 719-729.

Kappes, H. B., Oettingen, G., & Mayer, D. (2012). Positive fantasies predict low academic achievement in disadvantaged students. European Journal of Social Psychology, 42(1), 53-64.

Kappes, H. B., Sharma, E., & Oettingen, G. (2013). Positive fantasies dampen charitable giving when many resources are demanded. Journal of Consumer Psychology, 23(1), 128-135.

Krumboltz, J. D. (2009). The happenstance learning theory. Journal of Career Assessment, 17(2), 135-154.

Kuehnle, D. (2014). The causal effect of family income on child health in the UK. Journal of health economics, 36, 137-150.

Lin, M. J., & Liu, E. M. (2014). Does in utero exposure to Illness matter? The 1918 influenza epidemic in Taiwan as a natural experiment. Journal of health economics, 37, 152-163.

Lindeboom, M., Llena-Nozal, A., & van Der Klaauw, B. (2009). Parental education and child health: Evidence from a schooling reform. Journal of Health Economics, 28(1), 109-131.

Liu, H., Fang, H., & Zhao, Z. (2013). Urban–rural disparities of child health and nutritional status in China from 1989 to 2006. Economics & Human Biology, 11(3), 294-309.

Liu, J., Bennett, K. J., Harun, N., & Probst, J. C. (2008). Urban□Rural Differences in Overweight Status and Physical Inactivity Among US Children Aged 10□17 Years. The Journal of Rural Health, 24(4), 407-415.

Maccini, S. L., & Yang, D. (2008). Under the weather: Health, schooling, and economic consequences of early-life rainfall (No. w14031). National Bureau of Economic Research.

McGee, M. (2005). Self-help, Inc.: Makeover culture in American life. Oxford University Press.

Miller, B., & Lapham, M. (2012). The self-made myth: And the truth about how government helps individuals and businesses succeed. Berrett-Koehler Publishers.

Murphy, R. A., Schmeer, S., Vallee-Tourangeau, F., Mondragon, E., & Hilton, D. (2011). Making the illusory correlation effect appear and then disappear: The effects of increased learning. The Quarterly Journal of Experimental Psychology, 64(1), 24-40.

Nasir, Z. M., & Nazli, H. (2010). Education and earnings in Pakistan. Working Papers & Research Reports, RR-No.

Nickerson, R. S. (1998). Confirmation bias: A ubiquitous phenomenon in many guises. Review of general psychology, 2(2), 175.

Niekerk, C. H., Weinberg, E. G., Shore, S. C., Heese, H. D., & Schalkwyk, D. J.

(1979). Prevalence of asthma: a comparative study of urban and rural Xhosa children. Clinical & Experimental Allergy, 9(4), 319-324.

Office of the Press Secretary, The White House. (2012). Remarks by the President at a Campaign Event in Roanoke, Virginia. Retrieved from https://www.whitehouse.gov/the-press-office/2012/07/13/remarks-president-campaign-event-roanoke-virginia on December 22, 2015.

Oreopoulos, P., Stabile, M., Walld, R., & Roos, L. L. (2008). Short-, medium-, and long-term consequences of poor infant health an analysis using siblings and twins. Journal of Human Resources, 43(1), 88-138.

Paul, H. (2014). The Myths that Made America: An Introduction to American Studies (Vol. 1). transcript Verlag.

Pennycook, G., Cheyne, J. A., Barr, N., Koehler, D. J., & Fugelsang, J. A. (2015). On the reception and detection of pseudo-profound bullshit. Judgment and Decision Making, 10(6), 549-563.

Pigliucci, M. (2010). Nonsense on stilts: How to tell science from bunk. University of Chicago Press.

Pryor, R. G., & Bright, J. E. (2014). The Chaos Theory of Careers (CTC): Ten years on and only just begun. Australian Journal of Career Development, 23(1), 4-12.

Reinhold, S., & Jürges, H. (2012). Parental income and child health in Germany. Health Economics, 21(5), 562-579.

Safer, M. A., Bonanno, G. A., & Field, N. P. (2001). □''It was never that bad□": Biased recall of grief and long-term adjustment to the death of a spouse. Memory, 9(3), 195-203.

Salganik, M. J., & Watts, D. J. (2009). Web□Based Experiments for the Study of Collective Social Dynamics in Cultural Markets. Topics in Cognitive Science, 1(3), 439-468.

Schofield, Penelope, David Ball, Jennifer G. Smith, Ron Borland, Peter O'Brien, Sidney Davis, Ian Olver, Gail Ryan, and David Joseph. "Optimism and survival in lung carcinoma patients.□''Cancer 100, no. 6 (2004): 1276-1282.

Segerstrom, S. C. (2005). Optimism and immunity: do positive thoughts always lead topositive effects?.Brain, behavior, and immunity, 19(3), 195-200.

Shepperd, J. A., Waters, E. A., Weinstein, N. D., & Klein, W. M. (2015). A

primer on unrealistic optimism. Current directions in psychological science, 24(3), 232-237.

Steckel, R. H. (2009). Heights and human welfare: Recent developments and new directions. Explorations in Economic History, 46(1), 1-23.

Tabak, L. (1996). If your goal is success, don't consult these gurus'. Fast Company (December 1996).

Taleb, N. N. The black swan: The impact of the highly improbable. Random House.

Tomich, P. L., & Helgeson, V. S. (2004). Is finding something good in the bad always good? Benefit finding among women with breast cancer. Health Psychology, 23(1), 16.

US Department of Labor. Employment Projections. Retrieved from http://www.bls.gov/emp/ep_chart_001.htm on January 4, 2016.

Van de Poel, E., O'Donnell, O., & Van Doorslaer, E. (2007). Are urban children really healthier? Evidence from 47 developing countries. Social Science & Medicine, 65(10), 1986-2003.

Wolfe, B. L., & Behrman, J. R. (1982). Determinants of child mortality, health, and nutrition in a developing country. Journal of Development Economics, 11(2), 163-193.

Wood, J. V., Perunovic, W. E., & Lee, J. W. (2009). Positive Self-Statements Power for Some, Peril for Others. Psychological Science, 20(7), 860-866.

فائز سیال، شاہراہِ کامیابی

مصنف

لاہور میں مقیم عاطف حسین کا تعلق آزاد کشمیر کے ضلع باغ سے ہے۔ ان کی رسمی تعلیم اور ملازمت کے میدان تو بزنس ایڈمنسٹریشن اور کوالٹی مینجمنٹ ہیں تاہم وہ خود کو انہی شعبوں تک محدود نہیں رکھتے اور مختلف علوم کے مطالعے کا شوق رکھتے ہیں۔ سماجی دنیا کی پیچیدگی اور اس کے مطالعے کے طریق ہائے کار میں انہیں خاص دلچسپی ہے۔ آج کل پی ایچ ڈی کے حصول کیلئے کوشاں ہیں۔

سرمایہ داری نظام میں کامیابی اور ناکامی کے تصورات کو جس طرح انسان کے اخلاقی آدرشوں سے لاتعلق کیا گیا ہے اس سے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دنیا کو اصطبل بنایا جارہا ہے جہاں گھوڑوں کو یہ باور کروایا جائے گا کہ تم انسان کی ارتقاء یافتہ شکل ہو۔ کامیابی کے گُر بتانے والے کرتب بازوں کی پوری کھیپ، انسانیت سے رضاکارانہ دستبرداری کو ایک مقدس مشن بنا کر ہمیں ریس کا گھوڑا بننے پر آمادہ کرنے نکلے ہیں۔

احمد جاوید دانشور، مصنف، شاعر

اگر Reality Check کی بات کی جائے تو حقیقی کامیابی انسان کے ظاہر و باطن دونوں کے حوالہ سے ہی ہوسکتی ہے ورنہ "سیلف ایکچو الائزیشن" کا ہدف تشنۂ تکمیل رہ جائے گا۔ کامیابی کی لگن اور اس کے حصول کے طریقے درحقیقت منزل تک رسائی کو یقینی نہیں بناتے البتہ جدوجہد کے پیرایہ کو یقیناً سنوار دیتے ہیں۔

عاصم اللہ بخش دانشور، صحافی

کامیابی دماغ سے یا پاگلوں کی طرح بھاگنے سے حاصل نہیں ہوتی، اس کے لیے بقول گوروں کے، ایک Lucky Stroke of Fortune کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سپیکر بھائی چونکہ باتوں کی کمائی کھاتے ہیں اور نام خدا اچھے خاصے خوش حال بھی ہوتے ہیں تو اس بات سے متاثر مت ہوں کہ ان کی کامیابی کا گر ہی یہ ہے کہ وہ زبان سے خندق پار کرانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ ناکام آدمیوں کی سوانح کبھی لکھی نہیں جاتی، وہ لکھی جائے تو آپ دیکھیے کہ لوگ ساری عمر محنت کر کے بھی وہ کچھ حاصل نہ کر پائے جو آج آپ کے پاس موجود ہے۔

حسنین جمال صحافی، بلاگر، مصنف

کامیابی، مثبت سوچ، اپنی قسمت خود بنایئے-- واہ کیا شاندار الفاظ ہیں۔ مگر کیا یہ موٹیویشنل اسپیکرز ان الفاظ کو اپنے معاوضہ یا مالی فائدہ کی بنیاد کے علاوہ بھی کسی طور دیکھتے ہیں؟ مصنوعی مسکراہٹ چہرے پہ لگائے، کاروباری اخلاقیات کے بھرپور مظاہرے کے ساتھ جب یہ "بول کار" اپنے سامعین کے سامنے باتوں کے طوطا مینا اڑاتے ہیں تو دل کسی موسیٰ کی طلب کرتا ہے جو آکر اپنا عصا ڈالے اور یہ تماشا ختم کردے۔ جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے والوں کو جھنجھوڑ کر اٹھائے اور زندگی کی جنگ لڑنے کو حقیقی ہتھیار دے کر میدان میں اتار دے۔

شاہد اعوان بلاگر، رائٹر
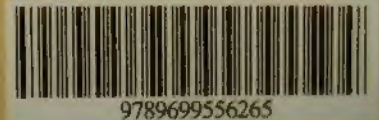
9789699556265

Price: Rs: 400

www.emel.com.pk